استنبول کہ عالم میں منتخب

سلمیٰ اعوان

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد۔لاہور۔کراچی

انتساب

کس کے نام یہ کتاب معنون کروں؟

تمہارے خوبصورت شاعروں، ادیبوں،

تمہارے خوبصورت ثقافتی ورثے، تمہارے جی دار لوگوں

یا

پھر اپنی اُس محبت کے نام لکھوں جو مجھے تم سے ہے

استنبول تم بھی تو کچھ بتاؤنا

میں کیا کروں

ترتیب

باب نمبر ۱: استنبول میں وارد ہونا
باب نمبر ۲: حضرت ابوایوب انصاری کے حضور حاضری
باب نمبر ۳: ایا صوفیہ
باب نمبر ۴: توپ کپی سرائے میوزیم
باب نمبر ۵: افطار کنوپی پر ترک پاکستان بحث مباحثہ
باب نمبر ۶: لٹنا میرا استنبول میں
باب نمبر ۷: تھوڑی سی آوارہ گردی اور تھوڑی سی دل پشوری
باب نمبر ۸: نیلی مسجد اور آراستہ بازار
باب نمبر ۹: سلطان محمد فاتح
باب نمبر ۱۰: مولانا رومی اور رقصِ درویشاں
باب نمبر ۱۱: مسجد سلیمانیہ اور شاہی قبرستان
باب نمبر ۱۲: استنبول کا قیمتی موتی سلیمانیہ لائبریری
باب نمبر ۱۳: ترکوں کا محبوب شاعر یونس ایمرے
باب نمبر ۱۴: استقلال سٹریٹ اور تقسیم میدان
باب نمبر ۱۵: دولماباشی پیلس
باب نمبر ۱۶: شہزادوں کے جزیرے
باب نمبر ۱۷: اسکدار اور کیڈی کوئے
باب نمبر ۱۸: الوداع استنبول

خوبصورت ترکی شاعری

میری آنکھیں بند ہیں
اور میں استنبول کو سن رہا ہوں
ایک دلکش سی پیاری لڑکی چلی جا رہی ہے
تعاقب میں فحش فقرے اور طعنے ہیں
میرے ہاتھ سے کچھ گر جاتا ہے
یقیناً ایک گلاب
پرندہ تمہارے سکرٹ میں پھڑ پھڑایا
تمہاری بھنووں میں خفگی سی بھر گئی ہے
میں جانتا ہوں
تمہارے ہونٹ نم سے ہو گئے ہیں
مجھے معلوم ہے
نقرئی چاند پتے کے درختوں کے عقب سے جھانکتا ہے
میں تمہارے دل کی دھک دھک سمجھتا ہوں
میں استنبول کو سن رہا ہوں
اور میری آنکھیں بند ہیں

اورہن ولی کینک

....

تنہائی

وہ جو اکیلے نہیں رہتے کب جانتے ہیں
خاموشی بندے کو کتنا خوف زدہ کرتی ہے
خود سے کوئی کتنی دیر باتیں کرتا ہے
کتنی بار شیشوں کی طرف دوڑا جاتا ہے
کسی ذی روح کی تمنا اور خواہش کرنا
وہ اسے کب جانتے ہیں

....

خواہشیں اور یادیں

خواہشیں عجیب ہیں
یادیں بھی عجیب ہیں
کوئی کیسے رہ سکتا ہے
مجھے بتاؤ
ایک ایسے شہر میں
جہاں سورج ہی نہ چمکتا ہو
یہ تو ممکن ہی نہیں
کہ نظمیں نہ لکھی جائیں
اگر آپ محبت کرتے ہیں
اور وہ بھی اپریل کے مہینے میں

اورہن ولی

میں تم سے پیار کرتا ہوں
اُسی طرح جیسے روٹی کھانے کیلئے نمک میں ڈبوئی جاتی ہے
اسی طرح جیسے کوئی تیز بخار میں رات کو اٹھ جائے
میں تم سے محبت کرتا ہوں
ایسی ہی جیسی پہلی بار سمندر پر کسی ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے ہوتی ہے
جب استنبول میں دھیرے دھیرے اندھیرا اُترتا ہے
میرے اندر کوئی چیز حرکت کرنے لگتی ہے
میں محبت کرتا ہوں تم سے
اسی طرح جیسے زندگی کی عنایت کیلئے خدا کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے

ناظم حکمت

....

تمہارا خیال بہت خوش کن اور امید افزا ہے
یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی خوبصورت گیت سنا جائے
ایک ایسی زبان سے
جو دنیا کی خوبصورت ترین ہو
لیکن میں گیت کو اب مزید نہیں سننا چاہتا
میں تو خود گانا چاہتا ہوں

ناظم حکمت

....

جیل کے اندر گلاب کے پھولوں بارے سوچنا تو ٹھیک نہیں

ہاں سمندر اور پہاڑوں بارے سوچنا اچھا ہے
گھڑی دو گھڑی آرام کیے بغیر پڑھتے لکھتے رہو
اب ایسی بھی بات نہیں کہ تم
دس پندرہ سال جیل میں گزار نہ سکو
گزار سکتے ہو جب تک کہ وہ موتی
جو تمہارے سینے کے بائیں جانب ہے
اپنی چمک نہیں کھو بیٹھتا

ناظم حکمت

....

باب نمبر:۱ استنبول میں وارد ہونا

۱۔ دنیا کے چند مشہور شہروں کی طرح استنبول بھی سات پہاڑیوں پر آباد ہے۔

۲۔ تیسری صدی کی یادگار ویلنس ایکوڈک Valens Aqueduct کے محرابی راستے سے گزرنا اور تاریخ جاننا دلچسپ عمل تھا۔

۳۔ سلطان احمت کا علاقہ بازنطینی دور سے عثمانی سلاطین تک تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا۔

ٹرکی کیلئے فراوانی شوق کا کچھ ویسا ہی عالم تھا جیسا کہ نئی نویلی دُلہن کو مکلاوے کا کہ جو سُسرال گھر جانے سے قبل اپنے گھا گھرے کو دائیں بائیں اوپر نیچے سے سیٹ کرتے ہوئے گنگناتی ہے۔

میرا گھگھرا سُوت نہ آوے
نی چاہ مکلاوے دا

کہنے دیجیے کہ ہم تخلیقِ پاکستان کے بعد پیدا ہونے یا یہاں آ کر ہوش سنبھالنے والی نسل بھی حد درجہ جذباتی اور اندھی عقیدتوں کی ماری ہوئی ہے۔ لاکھ اپنی روشن خیالی اور ماڈرن ہونے کا دعویٰ کرے۔ سچ یہی ہے کہ جڑیں تو برصغیر کی اُسی تاریخ اور روایات سے جڑی ہیں جنکے حامل ہمارے آبا وٗاجداد تھے۔ اُنکے لئے مکہ و مدینہ کے بعد عقیدتوں کا مرکز استنبول کی خلافت تھی۔ ترکی کے ہیرو سلطان محمد فاتح، سلیمان ذیشان اور آتا ترک سے ہمارا پیار ترکی

کے لوگوں سے کیا ہی کم ہوگا۔ایسے میں ٹرکی جانے کیلئے دل کا مچلنا فطری امر تھا اور کچھ جاننے کیلئے لاہور میں ایک ہی آدمی جان پڑتا تھا جو زمانوں سے ترکی کے عشق میں مبتلا ہے۔

اور وہ کون ہے؟یقیناً آپ سمجھ گئے ہونگے۔

پس فرخ سہیل گوئندی کے دروازے پر سیما اور میں نے دستک دے دی۔اندر تو ٹرکی ہی ٹرکی تھا۔کہیں ترکی کی اعلیٰ قیادتیں بلند ایجوت،شریک زندگی راشان ایجوت،طیب اُردوآن صاحب خانہ کے ساتھ محبتیں بگھارتے تھے۔

سچی بات ہے بڑے مرعوب ہوئے۔

ابتدائی سبق فرخ سے ہی پڑھے۔اسلام آباد جا کر ساری کارروائی بھی بھگتائی۔ہمارا تو خیال تھا کہ ترکی برادر ملک ہماری خواہش کی پذیرائی کیلئے ہمیں فوراً جہاز میں چڑھا دے گا۔مگر احساس ہوا کہ بھئی بڑی عملی قوم ہے۔جون کی تپتی لُو برساتی دوپہروں میں خجل خواری کروائی اور قواعد کے مطابق ہی کوئی ڈھائی ماہ بعد اذن دیا۔

جس سہ پہر روانگی تھی اُس صُبح نورپیر کے ویلے سے ہی موسلا دھار بارش کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے بھادوں بھی لوگوں کی لعن طعن اور کوسنوں سے بھری بیٹھی تھی۔لوگ بھی بیچارے سچے تھے۔مجال تھی جو یہ نا ہنجار جلتی،بلتی،سڑتی خلق خدا پر دو بوند کی صورت ہی مہربان ہوئی ہو۔اب جب رخصت ہونے والی تھی تو سوچا ہوگا کہ اس آبی ذخیرے کو کہاں اٹھائے پھروں گی۔رجاتی ہوں انہیں،چاہے مریں،چاہے ڈوبیں،میری بلا سے۔

اب اِس نامراد کو یوں پاگلوں کی طرح برستے دیکھ کر میں تو بوکھلائے پھرتی تھی کہ فلائٹ تو کمبخت لیٹ ہی ہوگی۔عصر کے بعد جب میں نے سیما کو اس کے گھر سے پک کیا

اُس وقت بھی یہ اِسی طرح پاگل ہوئی پھر رہی تھی ۔ درختوں سے ٹکراتی، عمارتوں کے دروازوں اور شیشوں کو بجاتی ۔

چلو شکر جہازوالوں نے بھی یقیناً کہا ہو گا۔''ہم کونسا تجھ سے کم ہیں ۔تیرے سینے کو چیر کر اوپر چلے جائیں گے اور تو دیکھتی رہ جائے گی۔

اور بھئی میں تو سچی بات ہے کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی ۔نہ بوندوں کی لڑیاں، نہ بادلوں کے چنگاڑتے ،شور مچاتے ہاتھی گھوڑے۔ایک نیا جہاں وا ہو رہا ہے ۔اقبال کی نمود صُبح جیسا۔

پروردگار کتنی دنیائیں ہیں تیری۔میں نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے اُسے مخاطب کیا ۔ایک وہ نیچے والی جو بادلوں سے ڈھنپی اور پانیوں میں نہاتی ہے اور جس کی میں رہنے والی ہوں ۔ایک یہ جواب میرے سامنے ہے جس کا گھر آنگن وہ بادل بنے ہوئے ہیں جنہوں نے دھرتی کے اوپر چھت تانی ہوئی ہے ۔

اور اب میں یہاں دُور جھیلیں دیکھتی ہوں ۔ مجھے تو دریا اور سمندر بھی نظر آتے ہیں ۔جزیروں پر بھی گمان پڑتا ہے ۔اور ہاں ذرا دیکھو تو سورج کی کرنیں کیسے خوبصورت زرفشاں سے راستے بنارہی ہیں ۔ یہ سمندر، یہ جھیلیں، یہ دریا کیا میری آنکھوں کے سراب ہیں ۔پر تیری سات آسمانی دنیائیں اُن کی بھی تو کوئی حقیقت ہے ۔یہ تیری دوسری دنیا بھی ہوسکتی ہے ۔چلو میں چھوڑتی ہوں اِس سارے قضیئے کو۔اور وقت کی ساعتوں سے لطف اندوز ہوتی ہوں ۔

صُبح کی روشنی میں زمین پر چٹانیں سی نظر آتی تھیں ۔کونسی جگہ تھی یہ؟بستیاں کہاں ہیں؟ پھر جہاز نیچے جُھکا۔پھر جھکتا چلا گیا ۔باسفورس نے اپنی جھلک دکھائی ۔فلک بوس عمارتیں نظروں سے ٹکرائیں، نیلے پانیوں کے اندر دھنسے دلفریب سے کٹاؤ والے اِس تاریخی

جزیرہ نما استنبول پر طائرانہ سی نگاہیں اِس کے حُسن ودلکشی کو جمال وکمال کا رنگ دیتی ہوئی نظر آتی تھیں۔کیا منظر تھے؟ہائے کتنے موہ لینے والے۔

اتاترک ایرپورٹ خاصا وسیع وعریض تھا۔پر خالی خالی سا تھا۔صبح کا وقت تھا شاید۔چلو کچھ مرحلے طے ہوئے۔کچھ بھولے۔8 نمبر کی بجائے کسی اور جگہ چلے گئے۔کھڑے سامان کا انتظار کرتے رہے۔وہ بیچارہ کہیں اور چکریاں کاٹ رہا تھا۔پھر کسی کو ٹرکش ایرلائن کا حوالہ دیا۔راہنمائی پر فوراً بھاگے اور اُسے جا کر قابو کیا۔اور جب میری متجسس آنکھوں نے دائیں بائیں اور مضطرب قدموں نے منی چینج آفس کی تلاش میں آگے پیچھے ہلنے کی کوشش کی۔سیما پیروز نے کسی قدر خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''کمبخت ذرا دم تو لے لے۔چُھری تلے گردن آ گئی ہے تیری کیا؟رات بھر کے سفر نے ادھ موا کر دیا ہے۔ہوٹل والوں کا کوئی بندہ بھی باہر انتظار میں ہوگا۔چھوڑ گیا تو اور سیاپا پڑ جائے گا۔پہلے ٹھکانے پہنچو۔صورت حال کو واضح ہونے دو۔یورو(یورپین کرنسی)ڈالر کا پتہ تو چلے ریٹ کیا ہیں؟ناواقفیت میں کہیں ہاتھ ہی نہ ہو جائے۔کاہلیوں(جلدی جلدی)میں کہیں ٹھک ہی نہ لگوا بیٹھیں۔

بات تو ٹھیک ہی تھی۔سوٹھک سے دل کو لگی۔''چلو اچھا'' کہتے ہوئے میں نے ٹرالی کا رُخ باہر جانے والے راستے کی طرف موڑ دیا۔

دیکھا کہ ہمارے ناموں کا پلے کارڈ ڈنڈے پر چڑھا ہمیں آواز دیتا تھا۔فوراً اسی جانب لپکے۔مستعد ڈرائیور نے ہمارا سامان قابو کیا اور گاڑی تک ہماری رہنمائی کی۔بڑی خوبصورت سڑکیں تھیں۔جاذب نظر منظر تھے۔

استنبول پر پڑھا ہوا کچھ یاد آیا تھا۔یہ شہر بھی روم بلز بن،ٹوکیو،ماسکو اور شملہ کی طرح اونچی نیچی کہیں کچھ ہموار،کہیں ناہموار سات پہاڑیوں پر ایستادہ ہے۔صفائی ستھرائی

میں کیسا شاندار کہیں بحیرہ مرمرا اور کہیں گولڈن ہارن کے نیلے پانیوں کے سنگ سنگ دلکش رنگوں میں لپٹا کنارے کنارے بہتا تھا۔تیز سراٹے مارتی ہواؤں کی طرح شُوں شُوں کرتی گاڑیوں کے ساتھ ساتھ بھاگتے جب انڈر پاس سے ویلنس ایکوڈک Valens Aqueduct کے محرابی راستوں سے گزرے تو ڈرائیور نے فوراً اس کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

’’آپ رومن شہنشاہ ویلنس کی بنائی ہوئی تیسری صدی کی یادگار میں سے گزری ہیں۔‘‘

ہم نے ’’اچھا‘‘ کہتے ہوئے اِس محراب در محراب شگافوں والے پل کو حیرت سے دیکھا تھا مگر بتانے پر جانا کہ زمانہ قدیم میں ایسی تعمیرات آبی ذخائر سے پانی لانے کیلئے بنائی جاتی تھیں۔یہ ایکوڈکٹ بیازت چوک کو پانی مہیا کرتی تھی۔

ایسے ایسے خوبصورت منظر آنکھوں کے سامنے آرہے تھے کہ دل بے اختیار ہی تقابلی جائزوں میں اُلجھ رہا تھا۔ہائے کاش ہمیں بھی ترکی جیسی قیادت نصیب ہو جائے۔ہم سے تو اپنا گند نہیں سمیٹا جاتا۔لاہور کے کوڑا کرکٹ کو بھی سمیٹنے کیلئے ترکی کی BMC ہی آگے بڑھی ہے۔

جامع سلطان احمد ایریا کے آر بوائے ہوٹل کے ریسپشن پر کھڑی لڑکی بڑی چھمک چھلّو قسم کی چیز تھی۔آنکھیں تو گویا ماتھے پر رکھی ہوئی تھیں۔چھوٹتے ہی بڑے منہ پھٹ انداز میں ہمارے ’’ناشتے اور کمرے‘‘ کا پوچھنے پر بولی تھی۔’’ناشتہ تو کل سے ملے گا۔اور ہاں ذرا صبر سے بیٹھیں۔

بھونچکی سے ہو کر میں نے سیما کو اور سیما نے مجھے دیکھا تھا۔

’’اُلّو کی پٹھی دیکھو تو ذرا کیسے ٹرٹر بولی ہے۔کل شام سے گھر سے چلے ہوئے

ہیں۔ساری رات آنکھوں میں کٹی ہے۔ ذرا سی مسکراہٹ ،چند شرینی میں ڈوبے جملے، پاکستانیوں کیلئے شہد جیسی نہ سہی کھٹی میٹھی گولیوں جیسا چاہت بھرا اظہار ہی ہوجاتا ۔جی چاہتا ہے ایک جھانپڑ رسید کروں ۔"سیما کورے برتن کی طرح تڑخ اٹھی تھی۔

میں ہنس پڑی تھی۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　　　جو چیرا تو اک قطرہ خون نکلا

خاطر جمع رکھو وہ بھی نہیں نکلے گا۔ہم نری جذباتی قوم یونہی ٹلّے پر چڑھنے اور چڑھانے کی عادی۔اُسے تو بزنس ایٹی کیٹس کا بھی خیال نہیں۔

اب منہ اُٹھائے دیکھتے ہیں کہ کب مہربانی ہوتی ہے؟ کب وہ کمرے کی چابی پکڑاتی ہے؟ ڈھیٹ بن کر ایک بار پھر اُس کے حضور جا کھڑی ہوئی۔"پلیز کمرے کا کچھ کر دیں۔بہت تھکے ہوئے ہیں ہم۔"چلو خیر جلدی سُنی گئی۔

کمرہ چھوٹا سا تھا مگر اچھا تھا۔نہانا دھونا ہوا۔پھر نیچے آئے۔ریسپشن پر اب نوجوان سا لڑکا کھڑا تھا۔کرنسی کا پوچھا۔اُس نے کسی لگی لپٹی کے بغیر واضح کیا۔ایک یورو 1.74 اور ایک ڈالر 1.35 ملنے کا امکان ہے۔۔لیکن دن اتوار کا تھا اور بینک بند۔سیما نے سو یورو بدلوایا اور کھانا مشترکہ کر دیا۔

صدیوں کی یہ ایمپائر کبھی کی قسطنطنیہ،عثمانی سلاطین کا دارالخلافہ،یورپ اور ایشیا کے دہانے پر کھڑا دنیا کا ایک بڑا میٹروپولیسنر ۔رخ روشن پر پڑے گھونگھٹ کو ابھی اٹھایا نہیں تھا پر شہر سے ہماری مرعوبیت تھی کہ اپنی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔

جس جگہ رہائش پذیر ہوئے تھے یہ سلطان احمت Sultan Ahmet کا علاقہ بازنطینی دور سے عثمانی خلفاء تک تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا۔پرانا شہر،استنبول کا ڈاؤن ٹاؤن جو نہ صرف سیاحت بلکہ ہر حوالے سے اہم اور بہترین سمجھا جاتا ہے۔چلو شکر

سیما کی عقلمند بیٹی عینی نے یہاں کی بکنگ کروا دی۔

پیٹ میں بھوک نے ایک ہاہا کار مچا رکھی تھی۔باہر آئے تو سٹریٹ میں ایک بڑی سی دوکان نظر آئی۔جنرل سٹور سا تھا۔شوہر، بیوی، بیٹی سبھی دوکان میں موجود چیزوں کی اٹھا پٹخی میں لگے ہوئے تھے۔ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں باتیں ہوئیں۔مہنگائی کا رونا تھا۔افرادخانہ کے ہاتھ بٹانے کا فخریہ تذکرہ تھا۔

سیاسی حوالے سے میری کچھ جاننے کی خواہش پر مرد نے طیب اردوان کے بارے ہنستے ہوئے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھتے ہوئے مذہبی ہونے کا تاثر دیا مگر ساتھ ہی آنکھیں نچاتے ہوئے یہ بھی کہا۔''اچھا کام کرتا ہے۔مہنگائی تو ہے پر عوام کو سہولتیں بھی حاصل ہیں۔استنبول کا جب میئر بنا تھا تو اس کی حالت بدل دی۔ارے استنبول تو اتنا گندا تھا۔اِدھر مسئلے ہی مسئلے تھے۔پینے کا پانی نہیں۔اسپتالوں میں غریب کا علاج نہیں۔صفائی ستھرائی نہیں۔اُس نے بڑا کام کیا۔لوگوں نے اِسے حکومت دے دی۔

مزے کے لوگ تھے باتونی اور ایکشن سے بھرے ہوئے۔

مجھے تو سب نے آنے (ماں) کی معتبر کرسی پر فی الفور بٹھادیا۔شوخ وشنگ اور دلیر سی سیما کے بارے متذبذب سے تھے۔بیچاروں کی پریشانی بھانپتے ہوئے میں نے فوراً کہا تھا۔

''آپ کے ہمسائے ہوئے ہیں۔آتے جاتے ملاقات رہے گی۔دوسرے رشتے کا انتخاب اطمینان سے کرلینا۔کوئی جلدی نہیں۔''

وہیں سے آئرن (لسّی) لی۔ساتھ بسکٹ لیے۔چلو کچھ گیلا کچھ سوکھا سا ناشتہ بھی زہر مار کیا۔ٹرام پر بیٹھے۔جس سٹیشن سے سوار ہوئے اُس کا نام گل ہانہ کاغذ پر لکھوا کر تعویز کی طرح سنبھال لیا۔ہوٹل کا کارڈ پہلے ہی پرس کی محفوظ جیب میں تھا۔

سڑک تو کچھ اتنی زیادہ کشادہ نہ تھی۔مگر بیچوں بیچ ٹرام کس مزے سے رواں دواں تھی۔کھڑکی کے شیشوں سے داہیں باہیں کی خلقت خدا کو بھاگتے دوڑتے، چلتے پھرتے، دوکانوں کے دروازے کھولتے اندر داخل ہوتے، باہر نکلتے دیکھنا کسقدر دلچسپ تجربہ تھا۔ناموس سے اسٹیشنوں کے نام تھوڑی دیر بعد گونجتے۔خودکار دروازوں کا کھلنا لوگوں کا چڑھنا اُترنا۔سامنے مشہور گلاتا پل نظر آتا تھا۔

''ایمی نونو مرکزی جگہ ہے۔''یہیں سے سب جگہوں کو راستے نکلتے ہیں۔لاہور سے فرخ سہیل گوئندی کی ہدایات یاد آئی تھیں۔یہیں اُترے تھے۔ایک اژدہام تھا۔انسانوں، دوکانوں، سٹیمر لانچوں، گاڑیوں بسوں، بھاگتے دوڑتے مردوں، عورتوں اور رنگا رنگ نظاروں کا۔کچھ دیر اردگرد کو دیکھتے رہے۔نظریں حیرت کے رنگ لیے اڑی پھرتی تھیں۔پھر وہیں فٹ پاتھ پر چنار کے درخت تلے دھرے بینچ پر بیٹھ گئے۔

تبھی سامنے سڑک پار ایمی نونو کی مسجد سے ظہر کی آواز بلند ہوئی۔اذان کی دلکش آواز نے میرے سارے سریر میں وہ لطیف اور گداز سا ارتعاش پیدا کیا تھا جس نے مجھے وحدت ملّتِ اسلامیہ میں پروئے ہونے کا احساس دیا جو رنگ، نسل اور جغرافیائی حدوں سے بالا ہے۔اُس وقت میرا مُو مُو عدنان میندریس کا شکر گزار ہوا جس نے اقتدار میں آنے کے بعد عصمت انونو کے ترکی زبان میں دی جانے والی اذان کے حکم کو ختم کیا۔اب اگر یہ اس وقت ترکی زبان میں ہوتی تو میرے پلّے کیا خاک پڑنی تھی۔اس اجنبی سرزمین پر اپنائیت کی یہ میٹھی سی جذباتی کیفیت بھلا کیوں کر پیدا ہوسکتی تھی۔

"اللہ اکبر اللہ اکبر"

میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔مجھے اپنے بچپن کے وہ دن یاد آئے تھے جب میرے سب سے چھوٹے ماموں ایف ایس سی کے طالب علم اخبار ہاتھ میں پکڑے نچلی

منزل کی دو دو سیڑھیاں الانگھتے پھلانگتے اوپر والی انگنائی میں داخل ہوئے تھے ۔اُنکی آواز جذبات کے ارتعاش سے رُندھی ہوئی تھی ۔

''ترکی کی مساجد سے عربی میں اذان کا دوبارہ آغاز۔''

وہ منظر آج بھی حافظے میں کہیں محفوظ ہے ۔میری نانی، میری خالائیں سب ہاتھ اٹھائے نم آنکھوں سے شکر گزاری کی کیفیت میں تھیں ۔بڑے ہو کر سمجھ آیا تھا کہ وہ سادہ، پڑھی لکھی، گھریلو سی عورتیں جنہوں نے کبھی ترکی نہیں دیکھا تھا کس رشتے میں گندھی اس عنایت پر اشک بار تھیں ۔انہیں اتاترک سے محبت تھی مگر انہیں اُس سے گلہ بھی تھا۔

عدنان میندرس کا نام بھی تبھی کہیں میرے حافظے میں محفوظ ہوا تھا۔اتاترک کا ساتھی جس نے اپنے لوگوں کے اندر کے دُکھ اور کرب کو محسوس کیا تھا۔سادہ اور معصوم سے وہ لوگ جو اپنے باپ دادا سے اُن کہانیوں کو سُنتے اور اُن اونٹوں پر رشک کرتے تھے جو اہل ترکی کی جانب سے مکّہ اور مدینہ کیلئے نذرانوں کے تحائف اپنے کوہانوں پر لاد کر اسکندارکی بندرگاہ سے چلنے والے بحری جہازوں سے عرب کیلئے روانہ ہوا کرتے تھے ۔اور یہ تفصیل بھی کہ مسجدوں سے اللہ اکبر کی صدا فضاؤں میں کیا گونجی کہ گلی کوچوں میں جذبات کا طوفان بہہ نکلا ۔حج اور عمرے سے پابندی کیا اٹھی کہ پورا ترکی گویا احرام باندھے تیار کھڑا تھا۔

میں نے اٹھتے ہوئے سیما سے کہا۔

''آؤ سجدہ کریں قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کی اُس سرزمین پر جس کی فتح کی بشارت میرے پیارے نبیؐ نے دی تھی ۔''

باب نمبر:۲ حضرت ابوایوب انصاری کے حضور حاضری

۱۔ حضرت ابوایوب انصاری کا کا علاقہ "ایوپ" ترکوں کیلئے بہت محترم اور مقدس ہے۔

۲۔ ہر نئے عثمانی سلطان کی رسم تاج پوشی جامع ایوب میں "سیف عثمانی" کمر میں حمائل کرنے سے ہوتی۔

۳۔ پرانے شہر کے گرداگرد صدیوں پرانی بلند و بالا فصیل شہر کیلئے تاریخ کا ایک خوبصورت تحفہ ہے۔

۴۔ ترکی کے سیاسی معاملات ہوں یا دینی امریکہ کی مداخلت ضروری ہے۔

نماز کے بعد ہم ایمی نونو نئی جامع (مسجد) کے اندر اُسکے طرز تعمیر اور مسجد کی تزین کاری کے حسن سے سحرزدہ سے باہر نکلے تو ہجوم میں دو نوجوان لڑکوں سے ٹکرائے۔ پکے پکے پاکستانی لگے تھے۔ فوراً تفتیشی مراحل سے گزارے گئے۔ چلو خیر جانکاری ہونے پر ہم نے پوچھا۔

"حضرت ابو ایوب انصاری کے مزار اقدس پر حاضری دینی ہے۔ کچھ رہنمائی کرو گے کہ کونسا راستہ اور کون سی سواری بہتر رہے گی۔"

ان کے معصومانہ جواب پر میرے منہ سے بے اختیار ہی نکل گیا۔

"لو انہیں دیکھو ذرا ماشاءاللہ سے کہنے کو مسلمان ہیں پر نرے بونگے ہیں۔ ارے چار دنوں سے استنبول میں ککھ (خاک) کھا رہے ہیں اور ابھی تک زیارت کیلئے نہیں گئے۔ جہاں سب سے پہلے جانا چاہیے تھا۔"

''ہمیں بھی ساتھ لے چلیے۔'' دونوں بول اُٹھے۔

میں تو انہیں ٹرخانے کے موڈ میں تھی، سیما لپٹانے کے اور دونوں لڑکے اماں اماں کہتے ہوئے لپٹنے کی ترنگ میں نظر آئے۔

سیما نے گھر کا۔

''کمبخت اتنی آپ پُھدری نہ بن۔نئی جگہ ہے۔کچھ سمجھ نہیں آرہی ہے۔چلو لڑکے ہیں تھوڑا سا سہارا رہے گا۔''

اس کی ڈانٹ ڈپٹ پر میں نے بھی سوچا''ارے دبئی کے کماؤ پوت ہمیں ماں جیسے اُونچے سنگھاسن پر بٹھانے کیلئے مرے جارہے ہیں تو وہاں بیٹھنے میں ہرج ہی کیا ہے؟آخر ہم اپنی نک چڑھی،بدتمیز اور ناشکری اولادوں کی بھی تو مائیں ہیں۔''

دو ٹیکسی والوں کو تو سمجھ ہی نہیں آئی کہ ہم کہہ کیا رہے ہیں؟ تیسرے والے کو ایوب سلطان کہا تو دروازے آناً فاناً کُھل گئے۔

اور جب میری نظریں گولڈن ہارن Golden Horn کے سبزی مائل پانیوں پر تیرتی کشتیوں اور لانچوں کو دیکھتی تھیں اور جب میں دو تہذیبوں، دو بڑاعظموں کے حامل اور تین اطراف سے سمندر سے گھرے ہوئے اس خوبصورت شہر استنبول کے جلوے دیکھتی تھی۔ علامہ کے خوبصورت اشعار ذہن کے کواڑوں پر دستک دیتے ہوئے کہنے لگے۔مہربانی کرو اور ہمیں گنگنا کر دُنیا کے اِس بیحد خوبصورت اور منفرد شہر کو خراج پیش کرو۔ گو آواز بڑی مدھم تھی پر میرا سارا وجود جیسے جذبات کی پھوار میں بھیگ سا رہا تھا۔

خطّہ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار

مہدی اُمت کی سطوت کا نشان پائیدار

صورتِ خاکِ حرم یہ سر زمین بھی پاک ہے

آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گُل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہَوا
تُربت ایوب انصاری سے آتی ہے صدا
اے مسلمان ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سینکڑوں صدیوں کی کشت و خون کا حاصل ہے یہ شہر

پختہ ہلکے ہلکے خموں والی سڑک جس پر ٹیکسی بھاگی جارہی تھی شاخ زریں یا Golden Horn کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب رواں دواں ہے۔گولڈن ہارن جو یہاں خلیج کہلاتی ہے استنبول کے یورپی حصے کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہوئے شہر کے مرکز میں گھستی چلی گئی ہے جس کا آخری سرا حضرت ابو ایوب انصاری کا مزار ہے۔

''کاش ہمیں علم ہوتا کہ یہاں کشتیوں اور لانچوں سے بھی آیا جا سکتا ہے۔''سیما کے لہجے میں تاسف تھا۔ٹیکسی کے کھلے شیشوں سے آتی ہوا سے گتھم گتھا ہوتے ہوئے میں بھی اُس کے ساتھ اِس افسوس میں شامل ہوئی کہ لانچ سے آنے کا تو ایک اپنا مزہ ہے۔

ایک جانب شاخ زریں کے دلفریب نظارے تھے تو دوسری جانب پُرانی کسی حد تک خستہ عمارتوں کا اپنا حُسن تھا۔گھنے سرسبز درخت، پہاڑوں کی ڈھلانیں، کسی گھر کی بالکونی سے جھانکتی کوئی عورت، کناروں پر کھیلتے بچے اور سڑک کے کنارے مکئی کے اُبلے بھٹے بیچتا ہوا کوئی بوڑھا سا آدمی سب ستمبر کی چمکتی دھوپ میں آنکھوں کو بھلے لگتے تھے۔

ٹیکسی نے جائے مقررہ کا اعلان داہنی جانب اُسے روکتے ہوئے کیا۔

دل دھڑکا اور آنکھیں نم ہوئیں۔گویا ہم اپنے نبی کے میزبان کے گھر آگئے ہیں۔اللہ ایسا تو صرف کبھی خیالوں میں ہی سوچا تھا۔

لڑکوں نے حق فرزندگی ماؤں کے منتوں اور طرلوں کے باوجود ادا کیا۔میں

احسان لینے کے حق میں نہ تھی پر کرتے کیا؟ اُلٹا کے زیرِ بار کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔

حضرت ایوب کا علاقہ بہت محترم اور مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ داخلی گزرگاہ کا ماحول بڑا مخصوص سا تھا۔ دوکانوں کا سلسلہ جن میں بکتی ہمارے تہذیبی ورثے کی نمائندہ چیزیں سبز چادریں، ٹوپیاں، تسبیحاں، دینی کتابیں وغیرہ۔ لوگوں کے دیکھنے اور بُلانے کے انداز میں بھی بڑی مماثلت تھی۔

استنبول کی مسجدوں کے میناروں کے سرے تیکھی بات ہے ہمارے غوری اور شاہین میزائلوں جیسے ہیں۔ مسجد ایوب کے سفید سنگِ مرمر کے نوکیلے مینار بھی بس یوں لگتے تھے جیسے ابھی اُڑیں گے اور پتہ نہیں کس کس کا دامن خاکستر کردیں گے۔ مسجد بہت خوبصورت تھی پر مسجد اور مزار سے پہلے وسیع وعریض قبرستان ہے۔

مسلمانوں کیلئے صحابیِ رسول کے قریب دفن ہونا بھی تو اعزاز سے کم نہیں۔ اسی لیے یہاں شاہی قبریں بھی کثرت سے ہیں۔ سلطان سلیم سوئم کی ماں اور اس کی دو بہنیں یہیں احاطے میں سلطان عبدالمجید اور عبدالعزیز کے بچے بھی یہیں دفن ہیں۔ بہت سے درباری، اُمراء، وُزراء، خواجہ سراؤں کی قبریں جن پر سبز چادریں اور چادروں پر قرآنی آیات لکھی ہوئی تھیں پڑی تھیں۔

اِن قبروں کے گرد طلائی کٹہرے بنے ہوئے تھے۔ کہیں بڑے بڑے شمعدان بھی نصب تھے۔ شاہی مقبرے خوب ہوادار اور روشن تھے۔ اُن کی کھڑکیوں کے دودھیا شیشے اور دروازوں کی بناوٹ انتہائی خوب صورت اور نفیس تھی۔ اُن کے فرش بھی قالینوں سے سجے ہوئے تھے۔ سلطان محمد دوم کا مقبرہ آرائش و زیبائش کے اعتبار سے ایک ننھا مُنا سا تاج محل نظر آتا تھا۔

مسجد کے سامنے ایک کشادہ صحن تھا۔ مسجد کی طرف جانے کی بجائے ہم لوگ صحابی

رسولؐ کے مرقد کی طرف بڑھے۔صحن میں چنار کا قدیم گھنا درخت جس کے بکھرے پتوں نے گند سا مچایا ہوا تھا طبیعت پر ایک بوجھ کی صورت میں گرا۔ہم لائن میں کھڑے ہو گئے۔اپنے جوتے شاپروں میں ڈال کر بغلوں میں داب لیے اور دُرود پڑھتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

سبز روشنیوں میں جھلملاتا نیلی ٹائیلوں سے سجا یہ کمرہ جس میں وہ عاشق رسول استراحت فرماتے تھے۔تعویز کی کُرسی زمین سے بلند تھی اور درجہ بندی کیلئے سنہری جنگلے غالباً طلائی تھے۔چھت سے لٹکتے قیمتی فانوسوں سے نکلتی روشنی کی شعائیں ماحول میں تقدس کے رچاؤ کو گہرا کرتی تھیں۔اور جب میں ہاتھ اُٹھائے فاتحہ پڑھتی تھی تو میری بکھری ہتھیلیوں پر وہ حروف پھیلنے لگے جو میری یادداشتوں میں کہیں محفوظ تھے۔

اِس استنبول کا پرانا رومن اور بازنطینی نام قسطنطنیہ تھا۔اسی قسطنطنیہ کی فتح کی بشارت میرے پیارے نبیؐ نے دی تھی۔اِسے فتح کرنے کیلئے پہلا حملہ امیر معاویہ کے دور خلافت میں ہوا۔حضرت ابوایوب انصاری اس وقت زندہ تھے اور انہیں یہ علم تھا کہ حضورؐ پاک نے قسطنطنیہ فتح کرنے والوں کو جنت کی بشارت فرمائی تھی۔چنانچہ 670ء میں عربوں نے اِس شہر کا جو پہلا محاصرہ کیا اس میں حضرت ایوب انصاری بہ نفسِ نفیس شامل تھے۔اِس معرکے میں آپ شہید ہوئے۔وصیت یہی تھی کہ مجھے یہیں دفنانا ہے۔آپ کو قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے دفن کر دیا گیا۔

اِس محاصرے میں معاویہ کا بیٹا یزید بھی تھا۔قیصر قسطنطنیہ کے اِس پیغام میں کہ دفنا جاؤ تم ہم تو قبر کھول کر ہڈیوں کا سرمہ بنا دیں گے۔مسلمانوں نے قیصر کو کہلوا بھیجا کہ یاد رکھنا اِس قبر کو اگر کوئی گزند پہنچایا گیا تو پھر شام کا کوئی گرجا اور معبد سلامت نہیں رہے گا۔

شام و عراق اور ایران و مصر کی فتح کے بعد سلطنت اسلامیہ کا ہدف یہ علاقہ

تھا۔امیر معاویہ کے عہد سے مہمات کا سلسلہ آگے عباسی خلفاء سلجوقی اور پھر عثمانی سلاطین کے زمانے تک جاری رہا۔

یہ 1453 ہجری تھی۔ ایدرنے کا جواں سال سلطان محمد قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا مصمم ارادہ کیے ہوئے تھا۔ پہلا حملہ ناکام ہوا۔ وہ بے چین تھا، بیتاب تھا، مضطرب تھا، ناامید تھا۔ شہر جغرافیائی محل ووقوع کے اعتبار سے ناقابل تسخیر لگتا تھا۔ خواب میں زیارت رسولؐ ہوئی۔ بشارت کی نوید تھی۔ ابوایوب انصاری کی قبر ڈھونڈنے کی بھی تلقین تھی۔ پس تو جنگی تیاریوں، جدید جنگی سازوسامان، حربی چالوں سے اُس نے بالآخر قسطنطنیہ فتح کرکے بشارت رسولؐ کی سچائی پر مہر ثبت کردی تھی اور اب اکیس سالہ فاتح سلطان محمد اپنے سات زاہد و عابد دلیر اور جنگجو سالاروں کے ساتھ پورا ہفتہ اس جلیل القدر صحابی کی قبر کی تلاش میں گزارتا ہے۔ اور صحابی رسول ابوایوب جو یہیں کہیں دفن تھے کو پانے کیلئے بےچین تھا۔

ساتویں دن دفعتاً مُلّا شمس الدین جو سلطان کا روحانی اُستاد تھا اور اس مہم جوئی میں جوش وجذبے سے شامل تھا نے بلند آواز میں چلّا کر کہا۔

''شہزادے مبارک ہو میں نے مزار ڈھونڈ لیا ہے۔''

سلطان نے بمعہ اپنے رُفقاء فوراً کھدائی شروع کردی۔ نو فٹ نیچے ایک مربع سل ملی جس کے نیچے انہوں نے زعفرانی رنگ کے کفن میں لپٹا ہوا بدن پایا جس کے ایک ہاتھ میں صحیح سلامت ایک گیند تھی۔ سبحان اللہ۔

اور یہی وہ مزار کی جگہ تھی جہاں اس وقت کھڑی میں انہیں دیکھتی تھی۔ ٹپ سے چند آنسو میری ہتھیلیوں پر گر گئے۔

علاّمہ پھر سامنے تھے۔

نکہتِ گُل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا

تُربت ایوب انصاری سے آتی ہے صدا۔

لوگوں کا ایک اژدہام تھا۔ سرخ وسفید چہروں والے نگران کو بڑے مستعد تھے۔ کِسی کو زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں دیتے تھے مگر لوگ بھی بڑے پیاسے تھے وہ تو چاہتے تھے پھسکڑا مار کر بیٹھ جائیں اور نظروں اور جذبات کے رُوح افزا شربت سے اپنی پیاس بُجھاتے رہیں۔ سیما آنکھیں بند کیے دعاؤں کے لامتناہی سلسلے میں کہیں گم تھی۔ اور وہ ہمارے دو فرزند بھی ہتھیلیوں کو آنکھوں پر رکھے خضوع وخشوع سے دعاؤں میں مصروف تھے۔

مزار کے سامنے ہی جامع ایوّب اور ایوب مسجد ہے۔

اب ہم مسجد ابوایوب کی طرف بڑھے۔ مسجد کے سامنے لمبا چوڑا خوبصورت صحن بکھرا ہوا تھا۔ یہاں سینکڑوں کبوتروں کی موجودگی، اُن کے پَروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور غٹرغوں ایک انوکھی سی موسیقی کو جنم دے رہی تھی۔

وضو کیلئے بنے گئے فوارے سے وضو کیا اور مسجد میں دعا پڑھتے ہوئے داخل ہوئے۔ مسجد کی تزئین نیلی ٹائیلوں اور لکڑی کے خوبصورت کام سے کی گئی تھی۔ جو فی الوقع بہت خوبصورت نظر آتی تھی۔ مسجد میں خواتین کیلئے مخصوص حصّے میں دو نفل شُکرانے کے ادا کیے کہ اُس نے ہمیں یہ دیکھنے کی سعادت نصیب کی۔ آپؐ سے متعلق کچھ مقدس چیزیں بھی موجود ہیں۔ موئے مبارک، نعلین مبارک یہیں ایک کمرے میں سبز چادر میں لپیٹا ہوا وہ علم بھی ہے جو حضور اکرمؐ نے کِسی غزوہ میں حضرت ایوب انصاری کو عنایت کیا تھا۔

کوئی ہجوم تھا لوگوں کا۔ بالعموم یہ حصّہ عام دنوں میں کھولا نہیں جاتا مگر اُس دن کُھلا تھا۔ یقیناً ہم قسمت والے تھے۔ یہیں جامع میں عثمانیہ سلطنت کے بانی سلطان عثمان اول کی تلوار رکھی ہوئی ہے۔ ایک خوبصورت سی رسم بھی اِس سے جوڑ دی گئی کہ ہر نئے عثمانی سلطان کیلئے لازم ہوا کہ وہ سب سے پہلے جامع ایوب انصاریؓ میں حاضری دے۔ شکرانے

کے نفل پڑھے اور امام مسجد تلوار اُسکی کمر سے مزین کرے۔یہ تقریب مولوی یہ درویش انجام دیتے تھے۔یہ ایک طرح رسم تاجپوشی تھی۔کسی جنگی مہم پر روانگی سے قبل بھی سالار لشکر اور معتبر جرنیل یہاں حاضری دینا ضروری سمجھتے۔

نئے شادی شدہ جوڑے یہاں سلام کیلئے حاضر ہوتے ہیں۔ایک ایسے ہی جوڑے کی ہم نے تصویر بھی بنائی۔

چند ایسے بچے بھی نظر آئے جو بے حد زرق برق لباس پہنے سر پر کلاہ اور کمر میں چھوٹی سی مصنوعی تلوار سجائے اپنی ماؤں کے ساتھ گھوم پھر رہے تھے۔ایک ماں سے بات کی تو اشاروں کی زبان نے سمجھادیا کہ بچے کی رسم ختنہ سے صحت یابی کے بعد اُسے دعا کیلئے لائی ہے۔

ہمارے دونوں فرزند اب ہمیں لے کر ایک ریسٹورنٹ میں آگئے۔کھانا تو ہم بھی چاہتے تھے پر تھوڑی سی کفایت کے ساتھ۔لیکن لڑکوں نے مار دھاڑ مچادی۔ٹھونس ٹھونس کر ماؤں کو کھلانے لگے۔لاکھ کہا اللہ کے بندو اُلٹی گنگا مت بہاؤ۔پر کماؤ پوتوں نے ایک نہ سُنی۔

پھر ٹیکسی میں بٹھا کر امی نونو بھی چھوڑ گئے کہ پانچ بجے ان کی واپسی کی فلائٹ تھی۔

امی نونو میں درختوں کے نیچے دھرے بینچوں پر بیٹھ کر ہواؤں کے جُھلار میں باسفورس کے پانیوں پر بکھری سنہری شام کی الوداعی دھوپ کا حسن ،اس میں تیرتے سٹیمر لانچیں، کشتیاں، جہازوں میں لوگوں کی لدلدائی، اُترائی اور اُس کے دونوں کناروں پر پھیلے ایشیا اور یورپ کے عالیشان گھروں کے سلسلوں کی قطاریں اور پرا تنا نیلا کچور آسمان کسی خوبصورت پینٹنگ کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔اِن خوبصورتیوں سے اپنی آنکھیں سینکتے اور اپنے

اردگرد پھیلی مچھلی، برگر، اُبلے بھٹوں اور بہت سی ایسی دوسری چیزوں جن کے ذائقوں اور ناموں سے شناسائی نہ تھی کی خوشبوئیں سونگھتے اور خریدتے ہوئے مجھے احساس ہوا تھا کہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی خریداری کے لیے بیگ میں سے نوٹ نکالنے، دینے، لینے، ہتھیلی پر رکھی غیر ملکی ریزگاری گننے اور حساب کتاب کرنے میں تھوڑا سا بکھیڑا پالنے کا تو ایک اپنا چارم ہے۔

شاخِ زریں جسے دیکھتے ہوئے ابھی واپسی ہوئی تھی کسی ضدی بچے کی طرح دھرتی ماں کے سینے میں اندر تک گھسی ہوئی اس وقت اپنی ایک الگ شناخت کے ساتھ بھی سامنے تھی۔

ٹرام پر چڑھنے، اس کے ہوٹے لینے اور استنبول کے نظری تعارف کیلئے بھی بے قراری سی تھی۔ خواہش کے اظہار پر سیما نے اسے فوراً رد کرتے ہوئے کہا۔

''چھوڑو اب۔ ہوٹل چلتے ہیں۔''

''سیما استنبول سے سرسری سا متعارف ہونا ہے اور تعارف کیلئے یہ سب سے سہل اور آسان طریقہ ہے۔''

سیما اس کے قطعی حق میں نہ تھی۔ ساری زندگی اپنے میاں کی محفوظ گود میں گزارنے والی کسی خطرے کو مول لینے کیلئے تیار نہ تھی۔ مگر ایسا کرنا ضروری تھا اور مجھ جیسی جنّی کے سامنے اُس کی کیسے چلتی؟ پچکار کر ٹرام میں چڑھا دیا۔

سیٹیں مل گئیں۔ نظارے بصارتوں کو آواز دینے لگے۔ اجنبی آوازیں سماعتوں سے ٹکرانے لگیں۔ اسٹیشنوں کے نامانوس سے ناموں کا اعلان ہوتا۔ بیازت، یونیورسٹی، کیپاہ، لوگ اُترتے چڑھتے ماڈرن حجاب پہنے عورتیں اور لڑکیاں۔ دورویہ فلک بوس عمارتوں کی رنگارنگی، شاندار دوکانیں کہیں شام کے ڈوبتے سورج

کی لالی کے رنگ اُن میں تیرتا پارکوں کا سبزہ۔کہیں ڈھلانوں پر سرو کے بوٹوں کے زرنگاری میں ڈوبے سر۔

صدیوں پرانی حفاظتی خستہ حال دیوار کو دیکھنا بھی بہت خوبصورت تھا۔قسطنطنیہ کے قدیم بادشاہتوں کا استنبول کیلئے یہ ایک عظیم اور خوبصورت تحفہ ہے۔شہر کو عظمت کا رنگ دینے میں اس فصیل کا اپنا ایک کردار ہے۔پرانے شہر کی تین اطراف اگر مرمرا اور باسفورس سے گھری ہوئی ہیں تو چوتھی جانب سنہری خلیج اُسے اپنی پناہ میں لیے ہوئے ہے۔

مرکز آفندی پہنچ کر اُترے۔قہوہ کیفے بڑا خوبصورت تھا۔کرسیوں پر بیٹھے لوگ زور وشور سے گپیں لگا رہے تھے۔ہم جب قہوے سے بھری گلاسیاں ہاتھوں میں پکڑے، چسکیاں لیتے، گردوپیش کو دیکھتے اور لُطف اٹھاتے تھے ہمیں احساس ہوا تھا کہ کوئی اہم مسئلہ زیر بحث ہے کہ باتوں کے ساتھ ساتھ اخبار بھی لہرایا جارہا تھا۔میرے لیے زبان یار من ترکی دانم والی بات تھی۔ایک دو سے پُوچھا بھی مگر وہ انگریزی میں کورے تھے۔مجھے جاننے کیلئے جیسے اُچھل پیڑے لگے ہوئے تھے مگر بات نہ بنی۔کسی کو انگریزی آتی تو کچھ پتہ چلتا۔ٹرام میں دوبارہ بیٹھے۔ساتھ بیٹھنے والوں کو گل ہانہ کا بتایا۔اور گل ہانہ آنے تک اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو لوگوں کی جان کھالی کہ وہ گل ہانہ آنے پر ہمیں بتاضرور دیں۔

یقیناً واپسی لوگوں کے بے پایاں تعاون سے خیروعافیت کے ساتھ ہوئی۔گل ہانہ سے ہمارا ہوٹل تو جیسے دو قدم کی چھلانگ پر تھا۔کمرے میں اُس وقت تک آرام فرمایا جب تک بھوک نے نہ ستایا۔سوچا کہ اٹھیں اور باہر نکلیں۔

ہمارا ہوٹل جس گلی میں تھا، وہ گلی کم اور ایک دڑے کا سا تصور زیادہ ابھارتی تھی۔عمارات کی دیواریں اپنی قامت کے اعتبار سے اتنی اونچی تھیں کہ دو پہاڑوں کے درمیان تنگ سے راستے کو دڑہ کہتے ہیں کی تعریف پر بلند قامت پہاڑوں کی مکمل نمائندہ

تھیں ۔یہیں ہمیں ایک ریسٹورنٹ نظر آیا۔اند جا گھسے ۔چھوٹا سا تھا۔لوگ بھی زیادہ نہ تھے ۔مگر تھا بڑا اچھا۔عملہ بھی بڑا مستعد اور انگریزی میں رواں دواں نظر آیا۔ہوٹل والوں کی طرف سے فوراً توجہ ملی۔

بڑے دلکش سے نوجوان نے آکر اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ وہ استنبول کے ایشیائی حصّے سے ہے۔نام حکمت احمد تھا۔پہلی ہی ملاقات میں کُھل گیا۔مہنگائی کا چھوٹتے ہی اُس نے بھی رونا رویا۔اُس رونے میں بہت سے دکھڑوں کے منہ کُھل گئے۔بیوی کی سگریٹ نوشی کہ اُس نے دن بھر میں دو ڈبیاں ضرور پھونکنی ہیں۔اب لاکھ سمجھاتا ہوں کہ دو سے ایک پر آجاؤ مگر سُنتی نہیں۔دو بچے اور دونوں کو مہنگے سکول میں پڑھا رہی ہے۔ایک بجے سے پہلے گھر جانا نصیب نہیں۔گھنٹہ تو جانے میں لگتا ہے۔ابھی اُس ارادہ مزید تفصیل میں جانے کا تھا مگر چند گاہکوں کے آجانے سے اٹھنا پڑا۔

چونکہ حکمت احمد اپنی غریبی کے رنڈی رونے رو بیٹھا تھا۔اس لیے اُسے یہ کہنے میں کہ کھانا اچھا بھی ہو اور سستا بھی ہم نے کوئی عار نہیں سمجھا۔کھانے سے پہلے چھوٹی سی ڈش میں سلاد آیا۔سلاد کیا تھا؟موٹا موٹا کٹا ہوا پیاز،ٹماٹر،کھیرا اور چقندر کے قتلے۔دوسری ڈش میں اُبلے ہوئے چاول،کباب اور دال تھی۔

ہماری ہی طرح کی دو بوڑھی عورتیں تھیں۔میرا خیال ہے مجھے کہنا چاہیے اُدھیڑ عمر کہ سیما بُرا مانے گی۔آسٹریلیا سے تھیں۔دونوں گہری دوست سیر سپاٹے کی شوقین جنہوں نے ہمیں دیکھتے ہی مسکراہٹیں بکھیری تھیں۔ہم نے بھی لپک کر محبت سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

اور جب ہم جانے کیلئے رخصت ہونے لگیں۔شام والے واقعے کی یاد گھسیٹ کر مجھے حکمت احمد کے پاس لے گئی۔میں نے اُس سے اِن دنوں کے کسی اہم واقعہ کا

پُوچھا۔چند لمحوں تک وہ جیسے آنکھیں جھپکتا رہا اور پھر جیسے اُسے کچھ یاد آیا۔

''اوہو۔اچھا اچھا'' کہتے ہوئے اُس نے بتایا۔

ترکی کے دینی امور کے ادارے کو حکومت کی طرف سے حکم ملا ہے کہ جمعے کے خطبے میں سورۃ ال عمران کی آیت۔''بے شک اللہ کے نزدیک دین تو اسلام ہے'' کو نہ پڑھا جائے بلکہ اس کی جگہ اس حدیث کی تلاوت ہو۔''گناہوں سے معافی مانگنے والا ایسے ہی ہے جیسے اُس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔''اِس حکومتی فیصلے پر مذہبی لوگوں نے شور مچا رکھا ہے۔دائیں بازو کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ایسا امریکہ کے دباؤ پر ہو رہا ہے کہ ترکی کا اسلامی تشخص متاثر ہو۔

''تم کیا کہتے ہو۔''میں نے یونہی ٹوہ لی۔

''میں تو نماز ہی نہیں پڑھتا ہوں۔مجھے کیا۔یہ جو سورتوں کے حوالوں سے معلومات ہیں یہ سب تو سیاحتی ڈیوٹی ہے کہ آپ جیسا کوئی سیاح پوچھ سکتا ہے۔حالات حاضرہ سے واقف ہونا ضروری ہے۔''

ہم تو سمجھتے تھے کہ امریکہ ہم جیسے ماٹھے ملکوں کے مونڈھوں پر ہی سوار ہے پر وہ تو ترکی میں بھی گھسا ہوا ہے۔

حکمت احمد کھلکھلا کر ہنسا اور بولا۔

''ارے بھئی ساری دُنیا اس کی رعایا ہے۔بادشاہ کا کام کیا ہے، رعیت کی ٹانگیں کھینچنا۔

باب نمبر:۳ ایاصوفیہ

۱۔ ایاصوفیہ "ڈیوائن وزڈم" کا تمغہ سینے پر سجائے، عثمانی سلاطین کی رواداری کی خوشبو اپنے اندر بسائے پُروقار ہیبت اور انوکھے طلسم سے بھری نظر آتی ہے۔

۲۔ سلطان احمت استنبول کا ڈاؤن ٹاؤن، اسکا حُسن اور تاریخ کا دل ہے۔

۳۔ یورپی طاقتیں ترکی کیلئے معاندانہ جذبات رکھتی ہیں۔

پیٹ پوجا اور یاری دوستیاں نپٹا کر جب ہم واپس ہوٹل پہنچے۔ ریسپشن پر کھڑے لڑکے نے ایک بروشر ہمارے ہاتھوں میں تھما دیا۔ یہ شہر کی خوبصورت جگہوں کی سیر کا پیکج تھا۔ میں نے بے اعتنائی سے اُسے دیکھا۔ چھوٹتے ہی انکار کردیا اور آگے بڑھ گئی۔

کسی بھی جگہ کی سیر کیلئے میرا طریق کار ہمیشہ بڑا مختلف رہا۔ لیکن مجھے مڑ کر دیکھنا پڑا تھا۔ سیما اپنی جگہ جمی کھڑی تھی۔ حسین تھی۔ چہرے پر غصے اور رعونت کے آڑھے ترچھے عکس بکھرے ہونے کے باوجود بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ کہیں میرے جیسی صورت ہوتی تو نری چمارن لگتی۔

وہ غرائی تھی۔

''نہ تمہیں خجل خوار ہونے کا بڑا چاؤ ہے ناں۔ تو وہ بھی ہولیں گے، بلکہ بسم اللہ تو ہوگئی ہے۔ دیکھو پلیز۔ یوں بے مہاروں کی طرح ادھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے چلو کسی گروپ کے ساتھ نتھی ہو جائیں اور قاعدے طریقے سے کچھ دیکھ لیں۔''

اُس کے پاس باتوں اور دلائل کا ایک ڈھیر تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ سب میرے

نزدیک فضول تھے۔

''دیکھو نہ کتنے لوگ دھڑا دھڑ بکنگ کروا رہے ہیں۔یہ سب پاگل تو نہیں۔''

بہر حال میں نے اُس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے 50 یورو فی کس کے حساب سے ایک دن کے پروگرام پر ٹک لگا دی۔اب پھڈا تو ڈالنا نہیں تھا۔

ڈائننگ روم شاندار ہی نہ تھا۔زمانے بھر کی چیزوں سے بھی ناکوں ناک بھرا پڑا تھا۔مغربی گوشہ ترکی کی سپیشل ڈشوں سے سجا،مشرقی کونہ مغربی لوازمات سے آراستہ۔ میرے جیسی ازلی حریص سبھوں پر ہاتھ صاف کرنا چاہتی تھی۔ہر ذائقہ سے زبان کی خاطر مدارت اوراس کی شناسائی کی خواہش مند تھی۔اُس بھونرے کی طرح جو پھول پھول اور ڈالی ڈالی پر منڈلاتا ہے۔میں بھی ڈھکن اٹھا اٹھا کر کھانوں کے رنگوں،شکلوں،اُن کے اندر سے اٹھتی خوشبوؤں کا معائنہ کرتی جاتی تھی۔جوسز کی اقسام کا کوئی شمار نہ تھا۔دودھ دہی،سریل پھر جیسے میری نظر ایک بڑی سی ہنڈیا نما برتن پر پڑی۔ڈھکن اٹھایا تو خوشبوؤں نے جیسے استقبال کیا۔پاس سے گزرتے ویٹر سے پوچھا۔

''یہ سپیشل ترکی ڈش کوکGuvec ہے۔اناطولیہ کے ہر گھر میں ہفتے کے تین دن پکنی ضروری ہے۔''

پلیٹ میں ڈالی اور کھائی۔کیا شاندار ڈش تھی۔آلوؤں،گاجروں،پھلیوں اور گوشت کے قتلوں سے سجی۔کسقدر چٹخارے سے بھری تھی۔

میٹھے میں بقلاوہ بھی چکھا۔مگر بادام اور پستہ سے بھرا ہوا حلوہ تو بڑا منفرد سفید براق ٹکیوں کی سی صورت والا جیسے ہمارے ہاں کا سوہن حلوہ ہو۔مگر نہیں جی اِس کی تو بات ہی نرالی تھی۔کوراچٹا اور ذائقے سے لبا لب بھرا پڑا۔فوراً اس کی دو ٹکیاں ٹشو پیپر میں لپیٹ کر بیگ میں رکھیں کہ دوپہر میں میٹھے کا کوٹہ پورا ہو۔

اپنی طرف سے دوپہر کے کھانے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔تیار ہو کر نیچے آئے تو بس آچکی تھی۔ساری بس میں دیسی تو بس ہم دو عورتیں ہی تھیں۔باقی پر تو میموں اور صاحب لوگوں کا ہی قبضہ تھا۔

یہ گائیڈ لوگ بھی بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ٹورسٹوں کو اپنی مرضی سے پٹخنیاں دیتے ہیں۔پہلے دو ڈھائی گھنٹے تو اُس نے کارپٹ اور ہینڈی کرافٹ کی اُن دو کانوں میں دستی کاریگری دکھانے میں لگائے جن سے یقیناً اُن کا کمیشن طے تھا۔

ترکی قالین یقیناً بے مثال تھے پر اسے کمال تک پہنچانے میں پہلے نمبر پر سیلزمینوں کی معلوماتی چرب زبانی تھی۔کس خوبصورت میٹھے اور شیرینی سے بھرے لہجے میں کہتے۔

''یہ قالین قونیہ کے نواحی قصبے قرہ مان کا ہے۔آپ تو قونیہ کی تاریخ سے بخوبی واقف ہوں گی۔''

مجھے ہنسی آئی تھی۔بھلا اُس کی روحانی فضاؤں کے ذکر کا قالین بافی سے کیا تعلق؟ہاں انہیں دیکھیں ذرا۔اُس نے دو بڑے قالین لہرا کر ہمارے سامنے بچھا دیئے۔یہ اسپارٹا کے ہیں۔''

واقعی گہرے عنابی اور اف وائٹ رنگوں کا دلکش امتزاج،ڈیزائن اور بنت لاجواب۔انہیں بنانے میں بہت دیر لگتی ہے۔توصیفی جذبات بھی آنکھوں میں گھول لیے تھے۔اب وہ ہمارے سامنے سمرنا کے قالین کھول رہا تھا۔سمرنا ازمیر کا پرانا نام ہے۔لیجیے صاحب آدھا ٹرکی تو کسی نہ کسی صورت میں سامنے آ گیا تھا۔

یہ بھی رنگوں اور نمونوں کے اعتبار سے لاجواب تھے۔جی چاہتا تھا سب اٹھا کر لے جائیں۔تاہم یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان کے تمثیلی مظاہروں میں جو جدت سٹائل اور مہارت تھی وہ اُن کے حسن کو دوچند کرتی تھی۔

کس سٹائل سے وہ بھاری بھرکم قالین کو زمین پر گراتے تھے ۔مجھے بے اختیار وسطی پنجاب کے گاؤں کی وہ الہڑ مٹیاریں یاد آئی تھیں جو گندم کے آٹے کے پیڑوں کو منڈے(پھلکے)بنانے کیلئے ہاتھوں میں لہراتے گھماتے ہوئے اسی دلربایانہ انداز میں توی پر پکنے کیلئے ڈالتی ہیں ۔

مٹی سے ظروف سازی اوراس پر تزئین کاری کا عمل بھی ہمارے ہاں کے کمہاروں جیسا ہی تھا۔وہی چاک پر مٹی کے لوتھڑے کو گھمانے اوراُسے شکل دینے کا عمل ۔تاہم یہاں کام میں جدت اورماڈرن ازم تھا۔

ہینڈی کرافٹ کی دوکان میں لڑکوں نے ڈانگریاں پہن رکھی تھیں ۔رنگوں سے یوں لتھڑی ہوئی جیسے فوجیوں کی کیموفلاج والی وردیاں ہوں ۔بڑے لڑکے نے اپنے بارے اوراس آرٹ بارے بتایا کہ وہ ترکی کے ایک چھوٹے سے قصبے کوتاہیہ سے ہے۔جواس فن کا گھر ہے۔یہاں یہ پیشہ آباواجداد سے ورثے میں ملتا ہے۔یہ ضرور ہے کہ ہم نئ نسل نے تعلیم حاصل کی اوراس میں روایت کے ساتھ ساتھ جدت کے استعمال نے اسے قابل فخر بنا دیا۔ہماری یہ چیزیں سجاوٹی زیادہ ہیں ۔کمرے میں رکھی گئی نمائشی اشیانے رنگ ونور کی بارش برسا رکھی تھی۔

پون گھنٹہ نہ ہوگا تو گھنٹہ سوا لگا لیجیے ۔جب ہمیں سلطان احمت سکوائر کے عین وسط میں بنے ات میدان میں لا کھڑا کیا۔بازنطینی اسے ہپوڈروم Hipodrome کہتے تھے ۔بس سے اُترنے سے قبل کمال کا دلکش منظر میری بصارتوں سے ٹکرایا تھا۔ایک طرف ایا صوفیہ اپنے میناروں اورمنفرد گنبد کے ساتھ ،دوسری طرف نیلی مسجد اپنے اوپر نیچے کے گنبدوں اور چھ میناروں کے ساتھ۔ذرا دوروہ عظیم الشان فصیل توجہ کھینچتی تھی ۔

بس سے نیچے اُتر کر نئے منظر ،نئی رعنائیوں کے ساتھ سامنے آئے تھے ۔اس

وقت دھوپ تیز تھی اور اس تیزی میں اس کے سرسبز لانوں، ان میں اُگے گل بوٹوں، شاہ بلوط اور چناروں کے درختوں کی ہریالیوں، اس کے چمکتے میدان، ان میں سربلند زمانوں کی تاریخ اٹھائے چوکور بلند و بالا کالموں کو دیکھنا کسقدر فسوں خیز تھا۔ غیرملکیوں کے پُرے گائیڈوں کو دائروں میں سمیٹے بے چاروں کو تاریخ سے ہلکان ہوتے دیکھتے اور سنتے تھے۔

میں زمان و مکان سے بالا کہیں اُس عظیم بازنطینی شہنشاہ کونسٹنٹین کی دنیا میں سانس لیتی تھی۔ جب وہ اس شہر کو رومن سلطنت کا دوسرا دارالخلافہ بنانے کیلئے اِسے اُسی معیار کا بنانا چاہتا تھا۔ اس میں تعمیراتی کام کا آغاز تو شہر فتح ہونے کے فوراً بعد septimus severus کے زمانے میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ تاہم اسے عروج تک پہنچانے میں کونسٹنٹین کو ہی خراج پیش کرنا ہوگا۔

سچ تو یہ ہے کہ اُس نے ہپوڈروم کو بھی ویسے ہی بنایا سجایا۔ ریس ٹریکوں میں بنے بمپروں کو آرٹ کے نمونوں سے حسن دیا۔ یہ رتھ ڈور کا ہی نہیں جو بازنطینیوں کی زندگیوں میں کھانے پینے جیسی اہم ضرورت جیسا جز تھا، بلکہ ہر نوع کی کھیلوں، ثقافتی سرگرمیوں اور میلوں ٹھیلوں کا مرکز بھی تھا۔ شاہی شادیوں کا اگر جنج گھر تھا تو عوام کا اتوار بازار یا جمعہ بازار بھی تھا۔ جو جی چاہتا ہے کہہ لیجیے۔ اُس دور کی ہر قسم کی ایجی ٹیشن سرگرمیوں کیلئے بھی اِسے ہی چنا جاتا۔ یہیں خوفناک قسم کے جھگڑے ہوتے۔ مارکٹائیاں ہی نہیں بلکہ بڑے پیانے پر قتل و غارت بھی ہوتا۔

وہ دلچسپ واقعہ بھی اِسی ہپوڈروم سے ہی متعلق ہے کہ سلطان ابراہیم کا وزیراعظم جو حد درجہ فربہی جسامت کا مالک تھا۔ اُس کی معزولی اور پھانسی کے بعد اس کی لاش کو اسی میدان میں پھینک دیا گیا۔ صُبح سویرے ایک ینی چری (عثمانی فوج کا خاص سپاہی) نے لاش کو دیکھا۔ اب یہ تو اللہ جانے کہ اس نے یہ سُن رکھا تھا یا یہ اس کی ذہنی اختراع تھی کہ موٹے

شخص کا گوشت جوڑوں کے درد کا موثر علاج ہے۔اُس نے فوراً لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہیں بیچنا شروع کردیا۔دس پیاسٹر کا ایک ٹکڑا۔

سیما ۔کس انہماک سے گلا پھاڑتے گائیڈ سے یہ کہانی سُن رہی تھی۔میں نالائق دائیں بائیں دیکھتی تھی۔خوبصورت آہنی جنگلوں میں مقید مصری obelisk ،سرفنٹائن اور کانسٹنٹائن کالم دیکھنے اوران کی تاریخ سے تھوڑی سی جانکاری کرنا بھی بڑے مزے کا کام تھا۔

ایک تو وقت کے بادشاہوں کو اپنے ناموں کے جھنڈے گاڑنے کا بڑا چسکا اور بڑا ارمان ہوتا ہے۔چیزوں کی اکھاڑ پچھاڑ۔یہاں سے پُٹو وہاں لگادو۔ان کیلئے ایسے کام بڑے پسندیدہ ہوتے ہیں۔اب یہ گلابی گرینائٹ والی ابیلسیک obelisk جسے فرعون تھوتھمس سوم نے دریائے نیل کی ایک چٹان سے کٹوا کر بنوائی اور مصر کے جنوبی شہر لکسر کے کرنک ٹمپل میں گاڑھی۔اس پر اس وقت کی رائج تحریری رسم الخط ہیرو گلیفکس Hieroglyphics میں کندہ کاری بھی کروائی۔میں نے لکسر شہر کے کرنک ٹمپل میں ایسے کئی نمونے دیکھے تھے۔اب بازنطینی شہنشاہ تھیوڈوس Theodosius اوّل نے اسے وہاں سے اکھاڑا اور لا یہاں نصب کیا۔

تمغہ کس کے گلے میں ڈالا جائے۔تھوتھمس کے یا تھیوڈوس کے۔اُس وقت میں بھی وقت کی ٹنل میں کھڑی تھی۔میں نے ہنستے ہوئے اِسے دونوں کے گلوں میں ڈال دیا۔

کانسٹنٹائن کالم Constantine کانسٹنٹائن ہفتم نے پیتل اور تانبے سے بنوایا تھا۔بیچارے کی زلزلوں، برفانی ہواؤں اور طوفانوں نے مت ماردی۔مگر شیر کا بچہ ابھی بھی کھڑا ہے۔چیلنج کرتا ہوا۔

سب سے دلچسپ پر اس کے ساتھ ساتھ خوفناک اور ڈراؤنے تاثر کو ابھارتا

سرفنٹائن serfentine کالم ہے۔یہ ات میدانی کا دوسرا بڑا کالم ہے۔جسے کانسٹنٹائن ڈیلفی (Dephi) کے اپالون Apollon ٹمپل سے لایا تھا۔یہ یونانیوں کی اُس فتح کی یاد میں ہے۔جو انہیں فارسیوں پر نصیب ہوئی تھی۔گائیڈ بتا تا تھا کہ کبھی یہ تین سروں والا اژدہا تھا۔مگر اب سر ور غائب تھے۔ایک کنڈل سا باقی تھا۔یوں دیکھنے میں بڑا ہی ڈراؤنا سا تھا۔سب سے زیادہ سیاحوں کا رش اسی کے گرد تھا۔

''ہائے یہ ات میدان تو ڈاؤن ٹاؤن کا دل ہے۔''میں نے گردوپیش پر ایک بھرپور نظر ڈالتے ہوئے خود سے کہا۔

اتنا حسین،اتنا تاریخی۔جرمن قیصر ولیم کا فوارہ بھی دیکھنے کی چیز تھی۔استنبول آیا تو سلطان عبدالحمید ثانی نے دیدہ و دل اس کی راہوں میں بچھائے۔یروشلم گیا تو باب جیفہ تک اُس کی بگھی کیلئے پکی سڑک بنوائی۔قیصر میزبانی سے ایسا متاثر ہوا کہ واپس جا کر یہ بنوایا اور ٹرین سے بھجوایا جو یہاں نصب ہوا۔

بھئی جرمنی اور ترکی میں بڑی محبت تھی۔سیما اور میرے درمیان مکالمہ ہوا۔ مفادات بھی ایک دوسرے سے جوڑے رکھتے تھے۔اِس دوستی نے ہی تو ترکی کو بُرے دن دکھائے۔وہ جو کہتے ہیں ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھے بھی لے ڈوبیں گے۔تو جب جنگ عظیم کا طبل بجا تو سیاسی بصیرت اور روشن نہیں تھا کہیں۔دوستی اور ماضی کے تعلقات پیش نظر تھے۔

چلو گھنٹہ بھر میں اس کی سیر سے بھی نپٹے۔حالانکہ ضرورت تھی کہ یہاں کچھ وقت مزید گزارا جاتا۔بہت خوبصورت ماحول تھا۔مگر نہیں جی ہوا کے گھوڑے پر سوار والی بات تھی۔چل سو چل۔

میرے صبر کا پیمانہ اُس وقت لبریز ہو گیا جب ایا صوفیہ کو دیکھنے کیلئے صرف آدھ گھنٹہ ملا۔ایا صوفیہ سے میری جذباتی وابستگی زمانوں سے تھی۔اس کی فینٹسی نے ہمیشہ مجھے

مسحور رکھا۔ ساتویں جماعت میں پڑھنے والی وہ لڑکی ہمیشہ میری یاداشتوں میں محفوظ رہی جو اپنی اردو کی کتاب میں ایاصوفیہ کی کہانی پڑھ کر اپنی کلاس میں ہی بیٹھی اس کی تصویر کو دیکھتی اور سر عبدالقادر کا لکھا ہوا احوال پڑھتی رہی تھی۔ سکول خالی ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی میں تھی اور ایاصوفیہ آج میرے سامنے مجسم تھی۔

ایک پر وقار ہیبت، ایک انوکھے طلسم قدم قدم پر منجمد کرنے والے سحر سے بھری ایاصوفیہ بہت سے ادوار کی کہانیاں سُناتی ہے۔ وہ کہانیاں جنہیں سُننے کی مجھے شدید تمنا تھی۔ بازنطینی طرز تعمیر اور مشرقی رومن ایمپائر کے دبدبے اور عظمت کی مظہر یہ جسے چرچ آف ڈیوائن وزڈم Church of Divine Wisdom کہا گیا ہے۔ یہ جس کی فضاؤں میں عثمانی سلاطین کی مذہبی رواداری کی خوشبو ہے۔ اس خوشبو کو محسوس کرنے اور سونگھنے کیلئے وقت درکار تھا۔

میں ہجوم سے الگ ہو گئی تھی۔ میں تھی، ایاصوفیہ تھی اور اندر باہر پاکستانی پاکستانی کی سارے میں ڈھنڈیا پڑی تھی۔ گائیڈ مجھے تلاش کرتے کرتے بے حال تھا۔ سیما میرے یوں گواچی گاں کی طرح منہ ماری پر تلملا رہی تھی۔

''تمہارے ہمیشہ سے ہی ایسے چھن رہے ہیں۔ سوات میں بھی تم نے مجھے اور نیلم کو یوں ہی ذلیل کیا۔ دریا سے چھپیاں ڈالنے بیٹھ گئیں اور ہم روتی رہیں کہ ہائے ہماری پیاری سہیلی کو لہروں نے نگل لیا۔''

''لعنت ہے تمہارے اوپر۔ مجھے بھی تپ چڑھی ہوئی تھی۔ تاریخ سے کچھ واقفیت ہو تو جانو کہ استنبول کی جگہیں ٹھنڈے میٹھے روح افزا کے وہ گلاس ہیں جنہیں مزے لے لے کر گھونٹ گھونٹ پینے کی ضرورت ہے۔ یہ الّو کے پٹھے پورا گلاس سانس لیے بغیر ہمارے حلق میں انڈیل دینا چاہتے ہیں۔ مجھے اُچھو نہیں لگوانا اور ہاں سُنو مجھے اپھارہ بھی کروانا۔''

''لوو ڈی اماں بنی پھرتی ہے تاریخ کی اور سُنا بھی مجھے رہی ہے جو تاریخ اور سیاست پڑھنے والے شوہر سے صُبح شام لیکچر سُن سن کر اس تاریخ سے ناکوں ناک آئی پڑی ہے۔''

اس وقت میں ایا صوفیہ کے سحر میں گم تھی۔ جوابی حملہ کر ہی نہیں سکی۔ مگر میں نے بس میں چڑھنے کے ساتھ ہی گائیڈ کو دیکھتے ہی زوردار آواز میں اعلان کر دیا تھا۔

''ہم آپ کا پیکج ہاف ڈے کا کر رہے ہیں۔ ہوٹل والوں کو مطلع کر دیجیے۔''

ہاف پیکج کا آخری آیئم گرینڈ بازار کی سیر تھی۔

گاڑی گرینڈ بازار کے قریب ایک پارکنگ میں آ کر رک گئی تھی۔

پہلے ایک عظیم الشان مسجد نظروں میں آئی۔ نور عثمانیہ مسجد۔ بائیں ہاتھ منی چینج آفس کی عمارت دکھائی دی۔

''چلو اچھا ہے کرنسی بدلوانے کی کوئی صورت تو نکلے گی۔'' میں نے خود سے کہا۔

گرینڈ بازار کے بیرونی دروازے کے ساتھ ہی منی چینج آفس تھا۔ میں اور سیماں فوراً سمیں گھس گئیں۔ جگہ تنگ اور لوگ زیادہ۔ میں آخری کونے میں جا کر کھڑی ہوگئی۔ شیشے کی چھوٹی سی دیوار میں بنے قوس نما کٹ میں سے سر کو جھکاتے ہوئے سیٹ پر بیٹھے بائیس '22' تئیس '23' سالہ خوش شکل سے لڑکے سے میں نے ڈالر اور یورو کا ریٹ پوچھا۔

''1.42 اور 1.82'' جواب ملا۔

''پر یہ تو کم ہے۔ 1.46 اور 1.85 ریٹ ہے۔

پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنایت کے اظہار کے طور پر میں نے پاکستانی ہونے کا بتایا۔ لڑکا کھلکھلا کر ہنسا اور بولا۔

''پھر تو 1.40 ہونا چاہیے۔''

میں کچھ حیرت زدہ سی ہوئی۔ترک پاکستان اور پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔سُنی سنائی اور پڑھی پڑھائی باتوں کے برعکس ہمارا ڈیڑھ دن کا تجربہ اگر ذیادہ حوصلہ افزانہیں تو مایوس کن بھی نہ تھا۔پر یہ تو خاصی دل شکنی والی بات تھی۔تا ہم میں نے سر جھکا اور نوٹ گننے لگی جو 1.42 کے حساب سے 284 لیرا ہی تھے۔

284 لیرے جو پرس کی اندرونی جیب میں آسانی سے کھڈے لائن لگ گئے تھے۔دوسوڈالر کی تو میرے ملک میں نوٹوں کی اچھی خاصی تھدی بنتی ہے۔بیرون ملک بیشتر پاکستانیوں کی طرح میرے سینے سے بھی لمبی لمبی آہیں نکلتی ہیں۔مقابلوں اور موازنوں میں ''کاش'' کی ہُوک کلیجہ تڑپاتی ہے۔

سب سے پہلے تو جس چیز نے نگاہ و دل کو قابو کیا وہ بازار کا کشادہ محرابی داخلی دروازہ تھا۔پیشانی پر کیپلی کارسی Kapalicarsi سنہ 1461ء درج تھا۔ زمانوں کی تاریخ اور ورثہ سنبھالنے والا یہ بازار۔

اُف مرعوبیت انتہاؤں پر تھی۔

عربی رسم الخط میں دو لمبی قطاروں میں خلافت اسلامیہ،سلطنت فلاں ابن فلاں کی تفصیل چمکتی تھی۔اندر الف لیلوی کہانیوں کی طرح تھا۔بیضوی چھتوں کے ساتھ آگے اور دائیں بائیں،اطراف سے محراب درمحراب پھیلتا ہلکے زردئی رنگ میں ڈوبا ہوا،جسپر شوخ رنگوں کی نقش و نگاری اسے بازاروں کی دنیا میں ایک انفرادیت دیتی تھی۔برقی قمقموں کی تیز جگمگاتی روشنیوں میں اسکی سجی ہوئی دوکانیں سیاحوں کے دلوں پر برق بن کر گر رہی تھیں۔

شاپنگ کبھی میرا کریز نہیں رہا۔پر سیما کی یہ کمزوری ہے۔ابھی ہمیں استنبول وارد ہوئے دوسرا دن ہے اور اُسے ہوٹل والی گلی میں جیولری کی دوکان نظر آ گئی ہے اور اُس کا دل ہیرے کی انگوٹھی پر بھی آ گیا ہے۔یہ اور بات ہے کہ ابھی بھاؤ نہیں بنا۔مگر مجھے امید ہے کہ

بارہ دن جب ہماری واپسی ہوگی وہ اس کی انگلی میں لشکارے مار رہی ہوگی۔

اُس نے بُسرا نامی کوئی سپیشل کپڑا بھی خریدنا ہے جس کی فرمائش اس کی لاڈلی بیٹی عروج نے کی ہے۔

''دیکھو میں یہ فضول کام ہرگز نہیں کرسکتی۔''واشگاف الفاظ میں میرا اعلان تھا۔

کپڑے کی چند دوکانوں کے سامنے اُسے کھڑا کرتے ہوئے کہا۔''چلو اپنا شوق پورا کرو۔میں کوئی پون گھنٹے بعد تمہارے پاس ہوں گی۔''

''اب گُم نہ ہوجانا۔''اُس نے تنبیہی نظروں سے مجھے گھورا۔اُس سے زیادہ میری منہ ماری کی عادت سے بھلا کون واقف تھا۔

بازار بُھول بُھلّیوں، پیچ در پیچ سلسلوں اور رنگ و بو کے طلسم سے بھری ایسی دنیا تھی جہاں بھٹکنے کا ننانوے نہیں سو فیصد چانس تھا۔میں نے احتیاط برتی۔ہر خم میں داخل ہوتے ہوئے اُس کی خصوصیات ذہن نشین کیں۔تھوڑا سا آگے جاکر واپس پلٹی۔پھر اِس عمل کو دہراتے ہوتے ہوئے کسی اور طرف بڑھی۔زیادہ مہم جوئی سے گریز کیا کہ سیما کا خیال اور اسکی ناراضگی پیروں کی بیڑی بن گئی تھی۔قریبی کیفے میں بیٹھ کر شیشے کے چھوٹے سے گلاس میں بغیر دودھ کے کسیلا قہوہ جسے میں نے پانچ چھ چینی کی کیوبز سے میٹھا کرلیا تھا پیتے ہوئے غیر ملکی سیاحوں کے پُرے دیکھتی تھی۔اتنا سیاح کہ دل سے بار بار ہوک اٹھتی تھی۔میرے مولا میرا وطن کب اِن نظاروں سے بھرے گا۔

نور عثمانیہ مسجد بہت شاندار اور خوبصورت تھی۔ظہر کی نماز پڑھنے اندر گئیں۔اِسکے اندر کے حُسن کو سراہا ضرور مگر تفصیلی ملاقات پھر کسی وقت کیلئے اٹھا رکھی۔

پچھلی جانب کے کشادہ کھلے میدان میں بنی فوڈ سٹریٹ کے ایک کھوکھے سے پُرتکال (مالٹا) کا جوس پیا اور ایا صوفیہ دیکھنے کیلئے روانہ ہوئیں۔

بازار سے باہر ایک ریڑھی والے سے مکئی کے بھٹے خریدے۔ یا اللہ 80 اسّی لیرے کا سُن کر اپنے ملک کو دعائیں دیں۔ بے چارہ ماٹھا سا ہمارا دیس جسے ہر کوئی گالیوں اور کوسنوں کی سان پر چڑھائے رکھتا ہے۔ دیکھو تو کتنا سستا ہے۔ یہی چھلّی دس پندرہ روپے کی مل جاتی ہے۔ گرما گرم نمک مرچوں کے کرارے آمیزے اور کھٹے میں لتھڑی ہوئی۔

ہم اب پھر ایا صوفیہ کے سامنے کھڑے تھے۔ ٹکٹ دوبارہ لیئے۔ یہ کبھی کا یونانی آرتھوڈوکس چرچ، عثمانی سلاطین کی مسجد، حال کا عجائب گھر سیمانے لاکھ کہا۔

''دیکھ تو لی ہے اب کیا اِسے چاٹنا ہے؟''

''ہائے سیما میرے زمانوں کا رومانس۔''

نظروں کے والہانہ پن سے میں اس کے مرکزی گنبد کو دیکھتی تھی۔ زعفرانی رنگ میں ڈوبے دوسرے گنبدوں کو تکتی تھی۔ تیز روشن کرنوں میں اس پر چمکتے سنہری جھلکیاں مارتے اس کے طلائی نشان کے ہوائی بوسے لیتی تھی۔ اس کے چاروں کھونٹ گڑے میزائلوں جیسے میناروں پر میری چاہت بھری نظریں تھیں۔

مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی عظیم الشان گنبد نے گردن اٹھانے کیلئے کہا۔ ماں بیٹے کی تصویریں۔ بازنطینی دور کی پینٹنگ کیسی خوبصورت اور باکمال۔ آنکھوں میں جلتی عقیدت اور محبت کی مشعلوں کی روشنی اُن تک پہنچائی اور آگے بڑھی۔ وسیع عریض ہال میں داخل ہوتے ہی جیسے ایک طلسم کدہ آنکھوں کے سامنے وا ہوتا ہے۔ آنکھیں حیرت زدہ سی چکرا چکرا کر کہیں اس کی بلند و بالا محرابوں سے ٹکراتی کہیں اُن میں ستونوں سے سجی بالکونیوں پر رُکتی ہیں۔ پھر گردن سر کو اوپر اٹھا دیتی ہے اور چھت اپنی فسوں خیزی کے ساتھ آنکھوں میں اُتر آتی ہے۔ اس کی ہیبت نے دیر تک جکڑے رکھا۔ پھر

محراب ومنبر نے متوجہ کیا۔پھر وہ واحد، رشتوں سے بے نیاز میرا رب میرا پیارا آقاؐ اور وہ میری چاروں عزیز ہستیاں۔ ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی۔ابو بکر،عمر،عثمان وعلیؓ نظر آئی تھیں۔آنکھوں میں مشعلیں سی جلیں۔دل کا کنول کھلا۔

سوچوں نے ایک منظر کھولا۔

وہ منظر جب وہ اکیس سالہ جیالا یہاں داخل ہوا تھا۔عفو و درگزر کا پیکر بن کر جس نے یہاں پناہ لینے والوں کو تحفظ دیا تھا۔اذان گونجی اور نماز ادا کی گئی۔گویا بشارت رسولؐ کی تکمیل ہوئی۔سبحان اللہ دل تو میرا بھی چاہتا تھا کہ میں یہاں سجدہ دوں۔مگر یہ اب میوزیم ہے دنیا کے دو بڑے مذاہب کا ورثہ سنبھالنے والا۔

دیواروں اور ستونوں پر محرابی صورت گیلریاں،بلند و بالا کھڑکیوں سے آتی روشنی فرش پر تماشے سے بناتی، انتہائی قیمتی اور جہازی سائز شیلنڈ لیئرز کی روشنیوں کے باوجود اندھیرا ٹھنڈک اور ایک باوقار سا طلسم اس کی رگ رگ میں پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔پورے دو گھنٹے ہم نے وہاں گزارے۔منظروں کو اپنی آنکھوں میں سموتے بالائی حصّہ بھی دیکھا۔جو عورتوں کیلئے استعمال ہوتا تھا۔دروازوں پر کندہ کاری بے مثل محراب در محراب ساخت والی چھتیں، کھڑکیوں پر دلکش نقاشی اور مقدس ہستیوں کی تصویر کشی صدیاں گزر جانے پر بھی آب و تاب کی لو دیتی ہوئی۔سیڑھیاں بہت زیادہ،اندھیرا اور پراسراریت کا طلسم یہاں بھی کار فرما تھا۔

میرے لیے وہ سب پینٹنگ بہت دلچسپی لیے ہوئے تھیں۔جہاں شہنشاہ Comnenos II اور ملکہ آئرن تھیں۔کہیں شہنشاہ کونسٹینٹن مونومیکیس اور ملکہ زوئے بیٹے کے ساتھ کھڑی تھیں۔کہیں وہ پیاری سی ورجن میری جسٹینن اور کونسٹینٹن کے ساتھ تھیں۔بازنطینی دور کے آرٹ اور عقیدے کے شاہکار۔

تعمیر کی تاریخ بھی بڑی دلچسپ اور معجزاتی ہے۔شہنشاہ کے خواب میں فرشتے نے آکر اس کا نقشہ پیش کیا۔کام کے طریق کار کی وضاحت کی اور ہدایت کی کہ پانچ ہزار مستری اور مزدور دائیں طرف اور اتنے ہی بائیں طرف کام کریں ۔ایک مرحلے پر جب پیسے کی کمی آئی اور تعمیر رُک گئی ۔فرشتہ کسی ہیجڑے کے روپ میں آیا اور اُس غار تک رہنمائی کی جہاں سے ٹنوں کے حساب سے سونا ملا۔معجزوں کی تفصیل بھی بڑی لمبی چوڑی ہے۔عیسائیوں کی ہی نہیں ،مسلمانوں کی بھی ۔

میرا خیال ہے مجھے سچائی کے ساتھ یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ میرے اندر اس کے مسجد بننے کے عمل کی پسندیدگی کہیں نہیں تھی ۔بعینہٖ اسی طرح جیسے مجھے مسجد قرطبہ میں گرجا گھر بنانا کبھی اچھا نہیں لگا۔آخر آپ تاریخ کے ساتھ کھیل تماشے کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں ۔گو اسمیں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ اس کی فضاؤں و ہواؤں میں اذانوں کے دلکش سحر کی بازگشت مجھے ہانٹ کررہی تھی ۔میرے اندر کی جذباتی وارفتگی میں میری مسلمانیت کا بھی کچھ دخل ضرور تھا۔اور مجھے یہ لکھتے ہوئے بھی کوئی عار نہیں کہ میں نے اپنی دونوں مختصری ملاقاتوں میں چند سیاحوں کی عیسائی ذہنیت کا بھی کچھ ایسا ہی مظاہرہ دیکھا کہ ان کے کیمروں کے فوکس حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ اور اُن سے متعلق دیگر ہستیاں اور واقعات ہی تھے ۔یہ بھی عین ممکن ہے کہ سیاحوں میں اُس وقت اتفاقیہ طور پر زیادہ تعداد آرتھوڈوکس کھیتڈرل کے ماننے والوں کی ہو۔

چلیئے اس بحث کو چھوڑیں۔اب پانچ سو برس سے مسجد کا چولا پہننے والی ایا صوفیہ کو ترکی کی جدید حکومت نے میوزیم کا درجہ دیتے ہوئے اسے مسجد اور گرجے کے جھنجٹ سے نکال کر اپنی روشن خیالی اور سیکولر پالیسی پر گامزن ہونے کا عندیہ دے دیا۔یہ اچھا ہی ہے۔جس کا جی چاہے وہ آئے اور اپنے دل کا رانجھا راضی کر لے۔

ہمارا ہوٹل وہاں سے قریب ہی تھا۔سوچا چلتے ہیں۔ایک دو گھنٹے کے آرام کے بعد پھر نکلیں گے۔مگر بھوک زوروں پر تھی۔کیا کھایا جائے؟ایک سوالیہ نشان۔شکر ہے وہاں قریب ہی کنٹین تھی۔دو ڈونر کباب سینڈوچ بنوائے۔آیرن (لسی) کو ترجیح دی۔

بھوک آداب نہیں جانتی۔بڑی کڑوی حقیقت۔کس والہانہ بیتابی و شتابی سے منہ ماری کی۔پہلا لقمہ اندر گیا۔ہری مرچ کا کوئی ٹکڑا دانتوں تلے آگیا تھا۔سی سی کے ساتھ جو لطف آیا وہ بھی بے مثال تھا۔سوچا اِسے کھول کر تو دیکھوں۔نان کے ٹکڑے پر پہلی تہہ کریم کی تھی یا دہی کی۔پتہ نہیں چلتا تھا۔ٹماٹر کی چٹنی اپنا پتہ بتاتی تھی۔اِن سب پر ڈونر کباب اپنے پہلو میں ہری مرچیں لیے قابض تھا۔ہم نے لپیٹ لیا۔

''ہائے میں صدقے کتنا مزیدار ہے۔'' کہتے ہوئے دوسری بائٹ لی اور لسی کا گھونٹ بھرا۔

دفعتاً مجھے پڑھی ہوئی ایک بات یاد آئی تھی۔

''ارے سیما۔ایا صوفیہ کے بیرونی حصّے کی ایک دیوار میں ایک سوراخ ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ حضرت خضرؑ نے اسمیں اُنگلی ڈال کر اس عمارت کا رُخ قبلہ کی جانب کر دیا تھا۔بھئی وہ تو دیکھنا تھا۔''

سیما نے اٹھتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

''عمارت قبلہ رُخ ہوگئی۔یہ بات کافی نہیں دل کی تسکین کیلئے۔مزید اسمیں نمازیں اور اذانیں بھی گونجیں۔ماشاءاللہ سونے پر سہاگہ۔تجھے رج ہی نہیں آنا۔چل ہوٹل ٹانگیں ٹوٹنے والی ہورہی ہیں۔اُس کی ایسی شاندار لتاڑ مجھے مُوت کی جھاگ کی طرح بٹھانے کو کافی تھی۔

میری غرض تو کمر سیدھی کرنے سے تھی۔ہاں سیما تھوڑی سی اُونگھ بھی چاہتی تھی کہ

تازہ دم ہو جائے کہ پھر بس ٹرام یا میٹرو کسی پر چڑھ کر تھوڑی سی اور آوارہ گردی کا پروگرام تھا۔میری بُری عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دن میں سونے یا آرام کرنے سے میں بڑی الرجک سی ہوں۔سیما تو لیٹتے ہی کسی دوسری دنیا میں پہنچ گئی۔میں نے تھوڑی دیر پلسیٹے (کروٹیں) مارے پھر اٹھ کر لفٹ سے نیچے لاؤنج میں آ گئی۔تپائیوں پر دو تین اخبار پڑے تھے۔چند چینی جاپانی بھی دکھتے تھے۔میں نے ان کی طرف توجہ دینے کی بجائے اخبارات کی پھولا پھرولی کیلئے ایک کو اٹھایا ہی تھا جب میرے عین سامنے آ کر بیٹھنے والے فربہی سے ایک مرد نے مجھ سے اُردو میں "پاکستان سے ہیں۔" کا پوچھا۔

ظاہر ہے اب اخبار کا چھٹنا فطری بات تھی۔گوراچٹا اونچا لمبا احسن کلیم جو پاکستانی نژاد ضرور تھا پر جرمن شہری تھا۔بزنس مین تھا۔پاکستان کیلئے اس کے پاس دُکھ اور غُصے بھرے جذبات تھے۔

''سیاستدانوں کے پاس وژن نہیں۔جرنیلوں نے ملک کے مشرقی ہمسائے کو دشمن اور مغربی کو سٹریٹیجک strategic نگاہ سے اپنا حلیف بنا کر رکھنے پر زور دیا۔ساٹھ کی دہائی میں پاکستان تیسری دنیا کے تیز ترین ترقی کرنے والے ملکوں کی قطار میں سب سے آگے تھا۔یہی چیز اس کے بدخواہوں اور دشمنوں کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔کولڈ وار میں گھسیٹ کر ایسا الجھایا کہ پرائی جنگ کو اپنے گھر میں ڈال بیٹھا۔

میں اُس وقت سیاسی اور فوجی حکمرانوں کی غلط پالیسیوں جس نے مذہبی جنونیت، گروہی اور لسانی تعصّبات، معاشرے میں بڑھتی ہوئی خون ریزی اور تشدد کو جنم دے کر پاکستان کو دہشت گردی کے حوالے سے دنیا میں بدنام کر دیا پر کچھ سُننے کی خواہشمند نہیں تھی کہ یہ جی کو نہیں خون کو جلانے والی باتیں تھیں اور ہم وطن میں یہی کام کرتے تھے۔

اُس کی اگلی بات اور بھی ڈرامائی انداز کی تھی۔

یہ ترکی جسے پاکستان اپنا رول ماڈل سمجھتا ہے اسے بھی بڑی طاقتیں اب اسی ڈگر پر چلانے کا پروگرام رکھتی ہیں ۔ اسے بھی انہی اندھیروں میں دھکیلنے کیلئے کام ہو رہا ہے جو پاکستان کا مقدر بنا دیا گیا ہے ۔ طیب اردوآن نے نورسی تحریک یا فتح اللہ گولین سے وابستگی کے باوجود ابھی تک اپنے آپ کو ایک اعتدال پسند لیڈر کے طور پر پیش کیا ہے اور ملک کو معاشرتی اور اصلاحی حوالوں سے مظبوط کرنے کے پروگرام پر سرگرمی سے عمل پیرا ہے ۔ مگر کہیں اُس کے اندر عالم اسلام کا لیڈر بننے کا ارمان ضرور ہے ۔ اپنے ہمسایہ ملک شام کے بہت سے معاملات میں مداخلت کرنے ، مشرق وسطیٰ میں اٹھی عرب بہار کی فضا میں اُسکا بشارالاسد سے اقتدار میں عوام کی شرکت کیلئے اصرار اور بشار کے مخالفین کی درپردہ حمایت یہ سب خوش آئند نہیں ہیں ۔

لمبی چوڑی بحث مباحثے میں پڑنے کی بجائے میں نے مختصراً اتنا ضرور کہا ۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ۔ ایسا سب ہونا شاید اس کے مقدر میں لکھا گیا تھا ۔ روس افغانستان میں آ کر بیٹھ جاتا تو دفاعی نظر سے یہ بھی ایک عذاب سے کم نہ تھا ۔ تاریخ گواہ ہے برصغیر کو جتنی بار روندا گیا وہ سب افغانستان کے راستے سے ہوا ۔ پاکستانیوں کو ابھی ایک قوم بننے کیلئے مدّت اور لیڈر درکار ہیں ۔

ترک تو ایک سکہ بند قوم ہے جو بڑے بڑے بحرانوں سے سرخرو ہو کر نکلی ہے ۔

رہا ترکی تو یہ بھی تاریخ بتاتی ہے کہ قومیں ایک وقت کے بعد اپنے اصل مرکز کی طرف لوٹتی ہیں ۔ روس کو دیکھ لیجئے ۔ چین کی واپسی بھی بہت آہستہ آہستہ شروع ہو گئی ہے اور ترکی بھی اگر اپنے مرکز کی طرف مراجعت کرے گا تو کیا نئی بات ہو گی ؟

ویسے تو یہ وقت عالم اسلام پر زوال کا ہے ۔ مدت کتنی ہے ؟ اس کا انحصار اوپر والے کی مرضی پر ہے ۔

اٹھنے میں عافیت سمجھی۔ کمرے میں آئی تو سیما اب باقاعدہ خراٹے لے رہی تھی۔ اُسے بے آرام کرنے کی بجائے میں خود بھی بستر پر لیٹ گئی۔ اور پھر ہوا یہ کہ آنکھیں جو بند ہوئیں وہ اُس وقت کھلیں جب دس بج رہے تھے۔

سیما بھی جاگ چکی تھی تھوڑی دیر اِس بحث مباحثے میں گزاری کہ استنبول کی راتیں جوان ہیں۔ یہاں کوئی ڈر ڈر نہیں۔ چلتے ہیں ٹرام میں بیٹھ کر ایک لمبے روٹ پر اور اُترتے ہیں یدی کولے yedikule جس کے بارے ریسپشن والے لڑکے نے بتایا تھا کہ وہاں کی زیادہ آبادی آرمینیائی ہے۔ اس کے ہوٹلوں میں ایسی خوبصورت موسیقی سننے کو ملتی ہے کہ بندے کا جی اسی میں غرق ہوجانے کو چاہتا ہے۔ مچھلی کھایئے۔ ایک خوبصورت رات سے بھرپور انداز میں ملیے۔

جتنے حربے استعمال کرسکتی تھی سب کیے۔ حُسن و خوبصورتی کے جتنے باغ دکھا سکتی تھی دکھائے مگر وہاں انکار تھا۔ ایک پکا انکار۔ پرائے دیس میں بھول جانے کا، کسی انہونی کے ہوجانے کا، ایک لمبی قطار خدشات کی۔ میں نے لعنت بھیجتے ہوئے منہ پر چادر ڈال دی۔

باب نمبر:۴ توپ کپی سرائے

۱۔ میوزیم کے درودیوار پر سلاطین عثمانیہ کی شان وشوکت اور جاہ وجلال کے بھرپور اظہار کے ساتھ ساتھ جائے عبرت کا رنگ بھی بڑا نمایاں نظر آتا ہے۔

۲۔ مقدس یوبلین کی زیارت آنکھوں کو بھگوتی اور دل کورقیق کرتی ہے۔

۳۔ احمد سوئم کو کتابوں، خطاطی اور گل لالہ کے پھولوں سے عشق تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ نئی اور اجنبی سرزمینوں پر اپنے وجود کو عجز کے جذبوں میں لپیٹ کر عبودیت کے گہرے احساس کے تحت جھکانا اور پیشانی کو زمین پر رکھنا ایک ایسا مسرور کن اور لطیف عمل ہے جس کی لذت کی وضاحت ممکن ہی نہیں۔شوق کی فراوانیوں نے بڑھاپے کو پچھاڑ دیا تھا پر گھٹنوں کی تکلیف نے ان لذتوں کے حصول کو کسی قدر مشکل بنا دیا تھا۔سجدے تو ضرور دیئے پر وہ میاں مدن کی سی بات کہاں؟ جسم و جان میں بھری بجلیاں تو قصہ پارینہ معلوم ہوئیں۔شاید اسی لیے صبح اُٹھتے ہی میرا نزلہ خود پر اور اوپر والے پر گلے کی صورت میں گرتا۔

میں بڑی کمبخت ہوں۔گلے شکووں کی ایک پٹاری۔جو ملا اُس پر شکر کم کم۔جو نہیں ملا بس سارا سیاپا اور سارا رولا اسی کا۔وجود کے اندر جتنی بھی طاقتیں ہیں۔دل، دماغ اور ضمیر

سب ہی بڑے تیز اور چلتر باز ہیں۔ایک دوسرے کے مقابل بڑی جی داری سے صف آرا ہوتے ہیں اور تیاپانچہ کر دیتے ہیں۔

اُس صبح بھی ایسا ہی گھمسان کا رن پڑا تھا۔

"کچھ تجھے تکلیف تھی جو تو جوانی میں میرا یہاں آنا نصیب کرتا۔" اوپر والے سے گلہ شکوہ شروع ہوا۔

"ارے روپیہ پیسہ تو تیرے پاس اگر جوانی میں نہیں، اُدھیڑ عمری میں تو آ ہی گیا تھا۔پھر تجھے موت پڑتی تھی ارادے باندھتے ہوئے۔" اللہ کی محبت میں لتھڑا کوئی جذبہ آگے بڑھا تھا۔

"لعنت ہے تجھ پر۔اپنے آپ ہی تیرّوں کے کولے برساتی رہتی ہو۔اوپر والا تیرا دانہ پانی سے کی گھڑیوں میں گوندھ کر تیرے نصیبوں میں لکھتا تب آتی نا۔چل اب صبر شکر کر اُس کا۔اب بھی اگر وہ یہ مہربانی نہ کرتا تو تو نے اُس کا کیا کر لینا تھا۔"

اب لمبی سی سانس کا اندر سے نکلنا بھی ضروری۔وہ نکلی اور ساتھ ہی ایک عدد مزید مکالمہ۔

"ہاں بھئی ہم مجبور بے بس بندے۔زور تھوڑی ہے کوئی اس پر۔"

اب جب سب ایک دوسرے کو لتاڑ بیٹھے تو قدرے سکون ہو گیا۔

چلو طاقت و توانائی کی وہ والی کیفیت تو باقی نہ تھی کہ جہاں میلوں پیدل چل کر بھی تھکن نہ چہرے کا حصہ بنتی نہ ٹانگوں کی پر وہ جو کہتے ہیں گوشت سڑ بھی جائے تو چنے کی دال سے نپٹ نہیں ہوتا۔میرا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔

دیسی گھی اور دیسی گندم کی پُروردہ ابھی بھی گولیوں کے بغیر چل رہی تھی اور اچھی ہی چل رہی تھی۔ہاں البتہ دودھ دہی پر زور کچھ بڑھ گیا تھا۔شاید اسی لیے ڈائننگ ہال میں

کیلشیم سے بھری چیزیں دہی، دودھ، زیتون کے پھل، اُبلے انڈوں کی سفیدی، پنیر سبھوں پر جی کھول کر ہاتھ پھیرنا میرا روز کا معمول تھا۔ سیما بھی کم و بیش اسی اصول پر عمل پیرا تھی۔

توپ کپی پیلس جانا تھا۔ کمرے میں آتے ہی میرے "چلو چلو" کا شور مچانے نے اُس کا تفصیلی میک اپ کرنا دشوار کر دیا تھا۔

"سنو"

اُس نے قدرے غصیلی، قدرے ترحم آمیزی نگاہ میرے اوپر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ میں تمہاری طرح منگتوں جیسے حُلیے میں اُٹھ کر باہر نہیں جا سکتی ہوں۔"

اس میں اگر خوبصورتی تھی تو دلربائی بھی تھی۔ یونہی تو ترک لوگ اکثر اُسے ڈارلنگ اور مجھے آنے (ماں) بنانے کی فی الفور پیشکش نہیں کرتے تھے۔ یوں ہمارے درمیان عمری چھوٹائی بڑائی تو بس برائے نام ہی تھی۔

توپ کپی جانے کے لیے ہم لوگ بلند و بالا کائی زدہ فصیل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کی بھاری بھرکم تاریخی حیثیت کو یاد کرتے کہ بنانے والے تو صدیاں گزریں رزق خاک ہوئے مگر یادگاریں ابھی بھی کسی نہ کسی صورت باقی مالکوں کو اتا پتہ دیتی ہیں۔ پہلی تعمیر طیودوس Theodosius اور ہرقل کے زمانوں میں ہوئی۔ نئے بادشاہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافے کرتے گئے۔

گل ہانہ پارک میں سے اُس راستے کی طرف مڑے جو قدرے بلندی کی طرف مائل تھا۔ پہلی ٹرن پر آرکیالوجی میوزیم کے سیاہ آہنی گیٹ سے آگے بڑھتے ہوئے ہم مسلسل اونچائی کی جانب گامزن رہے۔ پھر ایک وسیع و عریض قطعے کے سامنے گیٹ نظر آیا۔

گزشتہ رات کے اولین پہر میں توپ کپی پر لٹریچر پڑھتے ہوئے مجھے اس کے اندر جانے کے لیے چار دروازوں اور ان کے آگے پڑی توپوں کی وجہ سے اس کا نام توپ

کی مشہور ہونے کا علم ہوا تھا۔

ٹکٹوں کی خریداری کے بعد ہم نے چند لمحوں کے لیے رُک کر گیٹ کو دیکھا تھا۔ ہمارے ایک طرف وسیع و عریض پارک تھا۔ انتہائی خوبصورت، دلکش جس کے راستے درختوں سے سجے تھے۔ سبزے سے چمکتے لانوں میں رنگا رنگ پھولوں سے بھری کیاریاں تھیں۔ چنار اور شاہ بلوط کے درختوں کی بہتات تھی۔ حماقت کہہ لیجیے کہ کسی سے پوچھنے کی بجائے آگے بڑھنے لگیں۔ میں کون سی بہت ذہین، بہت فطین یا سقراط بقراط ٹائپ کی عورت تھی۔ گو میں اپنے طور پر رات کو اگلے روز دیکھی جانے والی جگہ کے بارے کچھ نہ کچھ پیشگی ضرور پڑھنے کی عادی ہوں۔ مگر ایک نیا شہر ہمیشہ ایک معمہ کی طرح ہوتا ہے جو آنکھوں اور دماغ سوزی کے بعد آپ پر دھیرے دھیرے کُھلتا ہے۔

سیما آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے چلتی مگر جہاں میں بھولتی وہ میرے لتے بھی لیتی۔ اُس کا لیکچر "اسی لیے کسی گروپ کے نتھی ہو جانا ہمیشہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ وقت کا ضیاع نہیں ہوتا۔" اِن الفاظ کے ساتھ شروع ہو جاتا۔"

آج بھی یہی ہوا جب باغ باغیچوں کے سوا کوئی قابل ذکر چیز نظر نہ آئی سوائے قدرے فاصلے سے توجہ کھینچتی ملگجے سے زنگاری رنگی اُس عمارت کے جو ضرور اپنی قدامت کا پتہ دیتی تھی۔ چلو شکر تھا کہ چند لوگ ہماری طرف آ رہے تھے۔ انگریزی بول سکتے تھے۔ انہوں نے آئرین چرچ کے بارے میں بتاتے ہوئے ہماری رہنمائی کی کہ ادھر کی بجائے آگے جایئے۔

اچھا تو یہ آئرین irene چرچ ہے۔ رات ہی اِس کے بارے پڑھا تھا۔ قدیم استنبول کی ایا صوفیہ کے بعد دوسری بڑی اہم یادگار۔ بازنطینیوں کا چرچ، عثمانیوں کا اسلحہ خانہ، اُنیسویں صدی میں آرکیالوجی میوزیم بننے والا اور آج کل کا کلاسیکل میوزک کنسرٹ۔

مڑنے سے قبل بلند و بالا فصیل بھی نظروں تلے آئی۔کسی جن دیو جیسی اتنی چوڑی کہ محل کا حفاظتی عملہ اس پر دو پہیوں والی چوبی گاڑی میں گشت کرتا تھا۔اور اس باغ کی ایک دلچسپ تاریخ بھی کہ انہی چناروں کے درختوں تلے وہ ینی چری(عثمانیوں کی خصوصی فوج)بغاوتوں کے مشورے کیا کرتی۔جس سلطنت کا تختہ الٹانا ہوتا۔اپنی کیتلیاں الٹی کر کے انہی درختوں کی شاخوں سے لٹکا دیتی تھیں۔یہ گویا بغاوت کا اعلان ہوتا۔

تو واپسی ہوئی سیما کی بڑبڑاہٹ کے ساتھ۔جی تو چاہا تھا ایک کرارا سا جھانپڑ دوں یوں کہ اس کی بولتی بند ہو جائے۔کمبخت جانتی ہی نہیں کہ بھولنے کا بھی اپنا ایک مزہ ہے۔پر اب میرے اس مزے کے منہ میں روڑ آنا شروع ہو گئے تھے۔

یہ مڈل گیٹ تھا۔جس کی نصف قوسی صورت کے اندر چوبی دروازے کی پیشانی طلائی کلمے اور سلطان محمد فاتح دوم کے طلائی طغرے سے سجی ہوئی تھی۔سلاطین کے دور میں آمد و رفت کے لیے باب ہمایوں یا امپیریل گیٹ استعمال ہوتا تھا۔جو حرم سرا کی تیس فٹ اونچی دیوار میں ہے۔نماز کے لیے ایا صوفیہ کی مسجد میں جانے کا یہ نزدیک ترین راستہ تھا۔

ساتھ جڑے دونوں میناروں کی بالائی بناوٹ ہمارے غوری اور شاہین میزائلوں جیسی تھی۔جن کی ساخت کے بارے میں تاریخ دانوں کی رائے ٹرک کی بجائے بازنطینی سٹائل کی ہے۔چیکنگ کے بے حد سخت کڑے اور خود کار عمل سے گزر کر ہم قدیم شاہوں کے انداز و اطوار اور موجودہ حکمرانوں کے بارے بحث مباحثہ کرتے ہوئے باب سلام یا مڈل گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔

رسٹ،سبز اور سنہری رنگوں کے امتزاج سے اُبھری ہوئی نقش و نگاری سے مزین چھتیں نگاہ و دل کو کھینچتی تھیں۔شیشوں میں مقید استنبول کے نقشے سے نظر ہٹی تو آنکھوں کے سامنے وسیع و عریض پارک سرو کے درختوں سے سجا تھا۔

باغ سے آگے دائیں طرف کے برآمدے مختلف وقتوں میں مختلف سلاطین حرم کی خواتین کے زیر استعمال بگھیوں اور گاڑیوں سے بھرے نظر آئے۔یہ بگھیاں اور گاڑیاں کل کی طرح آج بھی خاموش کھڑی تھیں۔کسی ذی روح کی مجال تھی کہ کوئی ان آنگنوں میں کھانس بھی سکتا۔جانور بھی آداب سلطانی سے آگاہ تھے۔ذرا آگے عربی فارسی کی تحریروں سے سجے بے شمار سنگ مرمر کے کتبے دھرے نظر آئے تھے۔

عثمانی سلاطین اچھے کھانوں کے کسقدر شوقین تھے اس کا اندازہ توپ کپی سرائے کے باورچی خانوں کو دیکھ کر ہوسکتا ہے یہ محراب دار برآمدوں اور رومن طرز تعمیر کے بڑے بڑے ہالوں جن کی ہشت پہلو چھتیں مرکز میں پہنچ کر گول دائروں میں بدل جاتی تھیں۔جن میں نصب گول سوراخوں والے بڑے بڑے روشن دان جو کسی حد تک ہمارے لاہور کی قدیم عمارتوں کی چھتوں کے حفاظتی پردوں جیسے نظر آتے تھے۔حرم نما بالائی ڈھانچہ اور اُن کی چمنیوں سے نکلتا ہمہ وقت دھواں سلطان کی فیاضانہ فطرت کا غماز تھا کہ بحیرہ مرمرا کے سمندروں میں دور دراز جگہوں سے آنے والے لوگ جان لیں کہ آٹھ سو باورچیوں اور ان کے بیشمار مددگاروں کے ساتھ چھ ہزار لوگوں کیلئے تیار ہونے والے شاہی دسترخوان سے انہیں کھانا ملے گا اور وہ بھوکے نہیں رہیں گے۔

چینی مٹی،شیشے،سلور،زہرمہرہ،پتھر کے برتنوں کی خوبصورتی ان کا سبک پن اور کہیں کہیں اُن کا جہازی سائز بھی حیران کرتا تھا۔ہر روز بیس ہزار انواع واقسام کے کھانے تیار ہوتے جنہیں چھ ہزار لوگ کھاتے۔یہ سارا راستہ چھوٹے چھوٹے قدرے ناہموار پتھروں سے بنا ہوا تھا۔یہیں سے ہمارا داخلہ Gate of facility میں ہوا۔

اس عمارت کا رنگ ڈھنگ آغاز سے ہی قدرے منفرد نظر آیا۔سبز قطعہ پر بسم اللّٰہ اور حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل کے سنہری حروف دروازے کی پیشانی پر سجے

تھے۔

سلطان کے ذاتی کمروں اور شاہی ملازموں کی اقامت گاہوں کی طرف جانے کا یہی راستہ تھا۔ گیٹ میں سے گزرتے ہوئے ہم دونوں رُکی تھیں۔ ایک چھوٹی سی سنگ مرمر کی توپ جو مقدس جھنڈے کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھی۔ وہی جھنڈا جو آقائے دو جہاں کے مبارک ہاتھوں نے تھاما تھا اور جسے مصر کی فتح کے بعد سلیم اول نے وہاں سے لا کر عالم اسلام کے خلیفہ کا تاج اپنے سر پر سجالیا تھا۔

سچ ہے عہدے، مرتبے، جاہ و عزت سبھی طاقت ور کو ہی سجتے ہیں۔

1914 میں اس کا آخری دیدار ترک عوام کو اس وقت کرایا گیا جب عثمانیہ فوج پہلی جنگ عظیم میں لڑنے کے لیے گئی تھی۔

یہاں سے کونسل ہال کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے سوچا تھا کچھ جگہیں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ہمیشہ ایک سی رہتی ہیں۔Gate of facility اگر آج نیوی اور سکائی بلیو یونیفارم والے کرخت اور سپاٹ چہروں والے گارڈز کے کنٹرول میں ہے تو گزرے ہوئے کل میں یہ گول لمبی ٹوپیوں اور ٹخنوں کو چھوتی عباؤں والے متکبر، ظالم اور انتہائی طاقتور سفید فام خواجہ سراؤں کے قبضے میں تھا۔ اس حصے میں سب سے اہم عمارت چیمبر آف پٹیشن ہی تھی۔ اسے دیوان یا کونسل ہال کہا جاسکتا ہے۔ سلطنت عثمانیہ کا مشاورتی چیمبر۔

وزراء امراء اور عمائدین مملکت کے ریاستی اور خارجی امور سے متعلق معاملات لوگوں کی عرضداشتیں، عدالتی فیصلے انکا اطلاق، غیر ملکی سربراہان اور سفیروں سے ملاقاتیں سبھی سرگرمیوں کا یہ مرکز تھا۔

آرائش و زیبائش میں کمال کی بلندیوں کو چھوتا یہ کمرہ۔ جس کے مرصع دروازے، عنابی مخملیں دیوان پر دھرا ہیرے جواہرات سے سجا تخت جس پر سایہ فگن کنوپی جس کی سنہری

زنجیروں سے لٹکتا فانوس حیرت زدہ کرتا ہے۔

ہمارے سامنے یہ تیسرے صحن کا پھلوں، پھولوں، درختوں، سبزے اور سیاحوں کے لیے جابجا دھری آرام دہ بینچوں سے سجا خفیف سی چڑھائی والا لان ہے۔پر بینچوں کا حال زار خاصا مخدوش تھا۔ایک تو کوئی خالی نہیں تھا۔دوسرے اُن پر بیٹھے چند جوڑوں کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کیسے ایک دوسرے کی بغلوں میں گھستے گھستے پسلیوں میں اُتر جائیں۔

سیما انکی ان اوچھی حرکتوں پر تلملاتے ہوئے چیں بچیں تھی۔پر میں مزے سے یہ سب دیکھتے ہوئے لُطف اُٹھا رہی تھی۔کبھی کبھی سرور آتا ہے بغیر ٹکٹ کے ایسے تماشے دیکھنے میں۔

شریفانہ سی صورت والے ایک جوڑے نے پورے بینچ پر قبضہ کیا ہوا تھا۔اُسی سے درخواست کرتے ہوئے ایک کونے میں تھوڑی سی جگہ بناتے ہوئے پہلے میں خود ٹکی پھر سیما کو ٹکایا۔

جوڑا فلسطینی تھا۔ہنی مون پر آیا تھا۔ہم تو بہت سی باتیں اُن کے ساتھ کرنا چاہتے تھے پر مسئلہ وہی زبان کا تھا۔چند ہی لمحوں بعد وہ لوگ بھی اُٹھ گئے۔جگہ کشادہ ہوئی تو ٹانگیں پسار لیں۔رُوح تک کو ٹھنڈا کرتی ہوا دھیرے دھیرے درختوں اور بوٹوں کے پتوں پر سے پھسلتے ہوئے بہہ رہی تھی۔کتنا چمکتا ہوا آسمان، کتنی چمکتی ہوئی دھوپ، کیسا خوبصورت ماحول، میں نے بے اختیار دائیں بائیں اور اپنے آگے پیچھے دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

اس توپ کپی سرائے میوزیم کے در و دیوار پر پھیلے رنگوں میں سلاطین عثمانیہ کی شان و شوکت، جاہ و جلال اور ہیبت و دبدبے کا کتنا بھرپور اظہار ہے۔آنکھیں جہاں ہر سمت بکھرے ہوئے اس اظہار سے لُطف اندوز ہوئی ہیں تو وہیں اسوقت سینے سے اُٹھتی ہوئی دکھ اور افسوس میں لپٹی یاس کی لمبی سی لہر آنکھوں کو نیلگوں آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے یہ بھی

بتا رہی ہے کہ دیکھو، انہیں غور سے دیکھو، یہ سب جائے عبرت ہیں، اور دنیا میں باقی رہ جانے والا سچ صرف وحدت ہے۔

تبھی ایک تیز گونجتی آواز مجھے میرے خیالوں سے باہر کھینچ لائی تھی۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا تھا۔ شمال کی طرف تھوڑی سی بلندی پر لائبریری کے چھوٹے سے ٹیرس پر کھڑے گارڈ نے فلسطینی لڑکے کو ڈپٹا تھا۔ لڑکے نے سیب توڑا تھا۔

"چلو اچھا ہوا۔ میری بھی طبیعت یہ کام کرنے پر مچل رہی تھی۔ اب ڈانٹ ڈپٹ کے ڈر سے چپکی ہوگئی ہوں۔"

سامنے کونے میں اُگے ہوئے کوتاہ قامت کسی حد تک گنجے سے سیبوں کے سبز پھل سے لدے پھندے پیڑ جنہیں میں نے شوق و رغبت سے دیکھا تھا اور مجھے بے اختیار سکردو، گلگت، ہنزہ کے سیبوں کے پیڑ یاد آئے تھے۔ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے سے قد بت اور پھل پھلواری سے لدے پھندے جن کی کیفیت اُن کمزور لاغر اور ناتواں لڑکیوں کی مانند ہی تھی جو بیچاریاں بیننے کی تباہ خیز جوانی کے ہاتھوں زچ سی رہتی ہیں۔

سامنے والے بینچ پر ایک خاندان بیٹھا ہوا تھا۔ میاں بیوی اور دو بچے۔ عورت حسین تھی۔ کھڑی ناک اور سرخ و سفید رنگت والی۔ مرد تانبے کی سی رنگت والا خاصا دلکش تھا۔

دفعتاً زور و شور کی آوازیں اُس قطعہ میں گونجیں۔ دو عورتیں اور ایک مرد ہمارے سامنے بیٹھے اُس جوڑے کی طرف بڑے والہانہ انداز میں بڑھے۔ بڑا پُرتپاک سا منظر تھا۔ پرانے ملاقاتی یا رشتہ دار معلوم ہوتے تھے، جو بھی تھے اُن کا خوش ہونا اور باچھیں کھلانا اُن کے خوشگوار تعلقات کا غماز تھا۔ تانبے کے سے رنگ والے مرد نے کھڑے ہو کر سب سے پہلے مرد کے دونوں رخساروں پر بوسے دیئے۔ پھر عمر رسیدہ عورت اور جوان عورت کے

گالوں پر۔ایسا ہی عمل آنے والے مرد نے کیا۔پھر خواتین نے ہنستی آنکھوں اور چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کے گالوں کو چُوما۔بچے پاس کھڑے یہ سب دیکھتے ہوئے شاید اپنی باری کے منتظر تھے۔واقعی اب سب ان کی طرف متوجہ تھے۔بچوں نے پہلے مرد کی ہاتھ کی پشت پر اپنا ماتھا رکھا پھر ہاتھ چوما۔اور یہی عمل دونوں عورتوں کے ساتھ بھی کیا۔یہ سب دیکھنا بہت دلچسپ لگا۔ترکی معاشرت کا یہ بڑا خوبصورت پہلو لگا۔

جب دیس میں تھی تو جانکاری بس اتنی سی تھی کہ حضورؐ پاک کی ذات مقدس سے متعلقہ چند اشیاء استنبول میں ہیں۔یہاں آ کر جانا کہ یہ توپ کپی میوزیم میں ہیں۔ہم پہلے اور دوسرے کورٹ یارڈ سے تیسرے میں آ گئے تھے اور مجھے ابھی تک وہ مقدس پویلین نظر نہیں آیا تھا اور میں تھوڑی سی بے چین بھی تھی۔

تبھی ایک احمقانہ اور جذباتی سی یاد نے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ ایک بار اخبار میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی تصویر ان مقدس اشیاء کی زیارت کرتے ہوئے چھپی تھی۔مجھ جیسی تھڑ دلی اسے دیکھتے ہی مارے حسد کے اپنے رب سے گلے شکووں پر اُتر آئی تھی۔

''ہاں ہاں ملکوں ملکوں کی سیریں تو تُو نے ان بڑے بڑے لوگوں کے مقدروں میں لکھ دی ہیں۔ہم نے تو یونہی ترستے ہی دنیا سے چلے جانا ہے۔''

اُس سے روشن نیلگوں آسمان تلے میرا ایک ایک مُو شکر گزاری کی بارش میں بھیگا۔

یہاں چند ہی دنوں کے قیام نے مجھے باڈی لینگویج میں خاصا ماہر کر دیا تھا۔ سکیورٹی گارڈ کے انگریزی سے پیدل ہونے پر میں نے با آواز بلند حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم پڑھتے ہوئے پوری بتیسی کی نمائش کے ساتھ ایک دانت پر انگلی رکھ دی اور دوسرے

ہاتھ سے چند بالوں کو پکڑ کر دکھایا۔

مقدس پویلین

اُس نے فوراً ذرا آگے شہ نشینوں والی عمارت کی طرف انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے Holy Relics chamber کہا۔سروں کو ڈھانپتے اور منہ میں دُرود کی تسبیح رکھتے ہوئے کم بلندی والے دروازے جس کی پیشانی لا الہ الا اللہ کے سنہرے طُغرے سے سجی ہوئی تھی اُس کے پہلے کمرے میں داخل ہوئے۔ایک روایت کے مطابق مقدس چیمبر کی راہداری میں سجے بہت سے طُغرے سلطان سوئم کے اپنے ہاتھوں سے لکھے گئے ہیں۔

بلند و بالا محراب دار نیلے اور ہلکے براؤن منقش ٹائیلوں والے درو دیوار قرآنی آیات، اللہ، اسکے رسولؐ اور صحابہ کے مقدس ناموں سے سجے رُوح پرور نظارہ پیش کرتے تھے۔مسجد نبوی کا ماڈل عمار بن یاسر، خالد بن ولید، جعفر طیار، سعد بن ابی وقاص چاروں خلفاء کی تلواریں۔کعبے کی چابیاں اور حجرا سود کا خول۔

میرے وجود کی باطنی آنکھ ایک جھٹکے سے کھُل گئی تھی۔جس نے سرپٹ بھاگتے گھوڑوں کے سُموں سے اُڑتی گرد، اُن کی ننگی پیٹھوں پر شہ سواروں کے ہاتھوں میں لہراتی تلواروں اور فتح کے شادیانے بجاتے اُن کے پُرنور چہروں کا پل بھر میں دیدار کر لیا۔بڑی میٹھی سی آواز میں کوئی کانوں میں گنگنایا تھا۔

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہاں وہ ایسے ہی تھے۔صاحب کردار و صاحب سیف۔

بھیگی آنکھوں سے میں درمیانی دروازے کے راستے آگے بڑھ گئی تھی۔سیما ابھی پہلے محراب والے حصے میں تھی۔

محض خوش شکل کہنا زیادتی ہوگی۔حُسن و جمال کا وہی حال تھا کہ جس کی وضاحت کے لیے محاورے وجود میں آتے ہیں۔عورتوں کی انگلیاں کٹتی ہیں۔شیشے کے چھوٹے سے کیبن میں بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔آواز کی نغمگی پر بھی خدا کی نظرِ عنایت تھی۔

کتنی دیر تک تو کھڑی اُس ترک بچے کو دیکھتی اور اُس کے حُسن کو سراہتی رہی۔ کمرے میں دبی دبی سسکیوں کی خفیف سی آوازیں تھیں۔کہیں رخساروں پر آنسوؤں کی بھی قطاریں تھیں۔کہیں متانت و سنجیدگی کی دلآویزیاں تھیں۔

شیشے کے دروازے کے پیچھے مرصع تلوار اور کمان نظر آئی تھی جو آقائے دو جہان سے منسوب ہے۔یہی وہ تلوار ہے جو ہجرت مدینہ کے وقت آپ کے ساتھ تھی۔جب اُن درویشانہ ہاتھوں میں تھی تو سادہ تھی جب بادشاہوں کے پاس آئی سونے سے مرصع ہوگئی۔

میں ذرا آگے بڑھ کر شیشے کے بکس میں پاؤں مبارک کا نشان دیکھنے لگی۔اُن کے پاؤں کا نشان۔کیسے راستے تھے جو معتبر اور مقدس ہوئے ان کے تلے آکر۔مٹی سُرمہ شفا ہوئی۔کاش کہیں تب جنم ہوتا۔

پھر وہ قیمتی مہر آنکھوں کے سامنے تھی۔وہی مہر جسنے قیصر و کسریٰ کو لرزہ براندام کیا۔اُن کے بے حد پیارے اور مقدس ہاتھوں سے لکھا ہوا وہ خط بھی تھا جو شاہ مصر کے نام تھا۔

موئے مبارک اور دانت دونوں سر بند۔لباس مقدس اور جھنڈا مبارک سونے اور چاندی کے بکسوں میں بند۔لباس مقدس کے پس منظر میں ایک خوبصورت سا واقعہ ہے۔ کعب بن زہیر نے حضورؐ کی شان میں لکھی گئی ایک نعت کے ذریعے حضورؐ سے فوری طور پر اسلام قبول نہ کرنے کی معذرت کی۔نعت کا ایک مصرع کچھ یوں ہے۔

یہ دنیا ہمارے نبی کے نور سے منور ہے۔

تاجدارِ دو جہاں نے خوش ہو کر اپنا عبائے مبارک عنایت فرمایا۔

کعب جب تک جیئے کلیجے سے لگائے رکھا۔ بعد از مرگ خلفاء نے حرزِ جان بنایا۔ بنی اُمیہ سے عباسیوں اور اُن سے مصر کے مُلوک تک پہنچا۔ 1517ء میں فتح مصر کے بعد عثمانی سُلطان سلیم دوم نے ان مقدس تبرکات سے استنبول کو سجایا اور اسے اپنے ساتھ رکھا۔

خرقہ مقدس کے بارے میں روایت ہے کہ یہ باہر سے کالی اُون اور اندر سے بادامی رنگ کا ہے۔ تو یہ وہی کالی کملی ہے جس کے عشق میں دُنیا مبتلا ہے۔ میں سامنے شیشے کے دروازے کے پیچھے رکھے گئے سونے کے صندوق کو حیرت و یاس سے تکتی تھی۔ کاش کہیں سلیمانی ٹوپی ہوتی تو اندر گھس جاتی۔ آنکھوں کو لگا کر بصارت تیز کرتی۔ ہاتھوں کو چھو کر انہیں پارس کرتی۔ ہونٹوں سے بوسہ دیتے ہوئے سانسوں کو عطر بیز کرتی۔

بظاہر میں سونے کے صندوق کو دیکھتی تھی پر ذہن تاریخ میں اُلجھا ہوا تھا۔ اور تصور نے اُڑا کر مجھے وہاں کھڑا کر دیا تھا جہاں ترکیہ کا سلطان وقت، عمائدین سلطنت اور خاص الخاص اہل خانہ کے ہمراہ پندرہ رمضان المبارک کو اپنے ہاتھوں سے اِس مبارک لبادے کو عرقِ گلاب کے پانیوں میں غسل دینے کے لیے نکالتا۔ غسل کے بعد اس پر ململ کا کپڑا رکھا جاتا۔ حاضرین صرف ململ کے کپڑے کو چھوتے۔ عرق گلاب تو ٹانک بن کر کہیں ایک جُرعہ یا ایک گھونٹ کسی نصیب والے کو ملتا۔ یہ بھی روایت ہے کہ چند سلاطین نے جنگ میں فتح کی ضمانت کے طور پر بھی اسے پہنا۔ ان میں محمد سوئم کا نام زیادہ مشہور رہا۔

ادھر اُدھر گھومتے پھرتے دفعتاً داخلی حصے کے بائیں طرف ایک لمبی سی روڈ پر نظر پڑی۔

''ارے'' بے اختیار ہی زبان سے نکلا تھا۔

''تو یہ عصائے موسیٰ ہے۔ سبحان اللہ۔''

ساتھ ہی اس عصا سے متعلق بے شمار معجزے یادداشتوں میں دوڑتے چلے آئے تھے۔

یہ حضرت موسیٰ کا وہی عصا ہے جس کا ذکر بازنطینی بادشاہ ہفتم نے اپنی کتاب Book of Ceremonies میں کیا ہے۔ کتاب کے مطابق عصا کو اصلی مقدس صلیب کے ھمراہ عظیم constantine the great یروشلم سے قسطنطنیہ لائے۔ یہاں اِسے بازنطینی بادشاہ کے عظیم محل سے ملحق ایک خصوصی گرجا میں رکھا گیا۔ اسکے عصا والے خانے میں ایک تلوار بھی رکھی گئی۔ اس کے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ یہ وہی تلوار ہے جس سے شاہ ڈیوڈ نے Goliath کو قتل کیا تھا۔ اسکے ایک طرف عربی اور دوسری طرف Assyrian زبان میں تحریر بھی ہے۔ اسکی دریافت بھی 1696 میں معجزانہ طور پر مصطفٰے دوم کے دور میں اندرونی خزانے سے ہوئی۔ اس نے بلقان میں اپنی فتح کو یقینی بنانے کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھا۔

دیوار میں بنی محراب کے فرش پر بیٹھتے ہوئے میں نے انتہا درجہ رشک بھرے جذبوں سے استنبول کے بارے میں سوچا تھا اور سیماں سے کہا تھا جو میرے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

''تو یہ عصائے موسیٰ ہے۔ سبحان اللہ'' بے اختیار ہی زبان سے نکلا تھا۔

ساتھ ہی اس عصا سے متعلق بے شمار معجزے یادداشتوں میں دوڑتے چلے آئے تھے۔

یہ حصرت موسیٰ کا وہی عصا ہے جس کا ذکر بازنطینی بادشاہ ہفتم نے اپنی کتاب Book of Ceremonies میں کیا ہے۔ کتاب کے مطابق عصا کو اصلی مقدس صلیب کے ہمراہ عظیم constantine the great یروشلم سے قسطنطنیہ

لائے ۔یہاں اِسے بازنطینی بادشاہ کے عظیم محل سے ملحق ایک خصوصی گرجا میں رکھا گیا ۔اس کے عصاوالے خانے میں ایک تلوار بھی رکھی گئی ۔اس کے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ یہ وہی تلوار ہے جس سے شاہ ڈیوڈ نے Goliath کو قتل کیا تھا۔اس کے ایک طرف عربی اور دوسری طرف Assyrian زبان میں تحریر بھی ہے ۔اس کی دریافت 1696 میں معجزانہ طور پر مصطفیٰ دوم کے دور میں اندرونی خزانے سے ہوئی ۔اس نے بلقان میں اپنی فتح کو یقینی بنانے کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھا۔

دیوار میں بنی محراب کے فرش پر بیٹھتے ہوئے میں نے انتہا درجہ رشک بھرے جذبوں سے استنبول کے بارے میں سوچا تھا اور سیما سے کہا تھا جو میرے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

''کیسا مالا مال ہے یہ''

طاقت کتنا بڑا ہتھیار ہے ۔عثمانی سلاطین نے خدا اور اس کے رسول کے گھروں کی اضافی تعمیر و مرمت طلب کام اور اُنکی آرائش و زیبائش کے کام ہمیشہ اپنے ذمے لیے۔ پر معاوضہ بھی خوب وصول کیا۔بے شمار مقدس تبرکات وہاں سے اُٹھائے اور استنبول میں لا سجائے ۔مصر کو فتح کیا تو قاہرہ کو خالی کر دیا۔طاقت اور زمینی پھیلاؤ کا ہما سر پر بیٹھا۔دولت کی دیوی چرنوں میں ڈھیر ہوئی تو خلیفہ یعنی عالم اسلام کے لیڈر ہونے کا کلاہ بھی اپنے سر پر رکھا۔

''زبردست کاٹھینگا سر پر۔

سیما دھیمے لہجے میں گائیڈ کو کسی یورپی وفد کے ساتھ بولتے سن کر سرگوشیانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

ہم امریکہ کو گالیاں نکالتے ہیں ۔اس سے انسانیت کی توقع کرتے ہیں۔ کتنے

احمق ہیں ہم لوگ؟ طاقت کا ایک اپنا چلن اور اپنا قانون ہے۔طاقت ور کا جو جی چاہے وہ کرے۔کمزور کو گلہ کا اختیار نہیں۔راستہ صرف ایک ہے طاقت ور بنو۔''

بات تو سولہ آنے سچ تھی۔

''واقعی اب جب سعودی عرب خود امیر کبیر ملک ہے۔اپنے مقدس نوادرات کی واپسی کا تقاضا کر بیٹھا ہے۔''

گارڈ ہمارے سر پر آ کر کھڑا ہو گیا۔اشارے سے اُس نے اُٹھنے کو کہا اور اشارے سے ہی یہ بھی واضح کیا کہ یہاں بیٹھنا منع ہے۔یہ اور بات ہے کہ اُٹھنے میں مدد دینے کے لیے اپنے بازو کا سہارا بھی دیا۔پر اٹھتے اٹھتے میں پنجابی میں بہت بڑ بڑائی تھی۔

''ارے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے مالا مال ایک ترقی یافتہ ملک جہاں سیاحت اسکا ایک بڑا کماؤ پوت بن گئی ہے۔ادھر ویک اینڈ ہوا ادھر اس کے یورپی اور عرب ہمسائیوں کے شوقین، من چلوں اور جوانوں، بوڑھوں کے ٹولے سلطان احمت سکوائر میں بکھرے نظر آتے ہیں۔استنبول کے ہوٹلوں میں کمرہ ملنا مشکل ہوتا ہے۔کیا ہے جوان کے آرام کیلئے چوبی بینچوں کا اہتمام کر دیا جائے۔بیچارے ہم جیسے دعائیں ہی دیں گے۔جیسے میں ماسکو اور پیٹرز برگ والوں کو دیتی تھی۔

لائبریری

کتابیں اُن سے محبت اور لائبریریوں کے سیٹ اپ ہمیشہ شاہوں اور رعمائدین سلطنت کے ذوق کے عکاس ہوتے ہیں۔احمد سوئم ماہر اور مشتاق خطاط اور کتب ناقہ لکھنے والا تھا۔لائبریری کی تعمیر اُس نے اپنے اور شاہی ملازموں کے لیے کروائی۔مقدس چیمبر کی راہداری کے عین اوپر عربی میں اُس نے خود خطاطی کی۔

اس کی تعمیر کردہ لائبریری حُسن و جمال کا مرقع تھی۔احمد سوئم کے دور کو تو ٹیولپ پیریڈ بھی کہا جا

سکتا ہے کہ گُل لالہ میں اُس کی حد درجہ دلچسپی نے نہ صرف باغوں کو زینت بخشی بلکہ اُس کی یہ جمالیاتی حس کپڑوں اور ٹائلوں کے ڈیزائنوں میں بھی اُبھر کر سامنے آئی۔

لائبریری کا ڈھانچہ اُوپر تلے کی بڑی بڑی کھڑکیوں اور مطالعہ کے لیے آرام دہ نچلے دیوان کے ساتھ بڑا پُر وقار نظر آتا ہے۔ ذیلی ڈھانچہ کھڑکیوں کے ساتھ بلند ہے کہ تازہ ہوا کی باقاعدگی اور تواتر سے آمد و رفت الماریوں میں رکھی گئی قیمتی کتابوں اور مسودات کو نمی سے محفوظ رکھے۔

''اللہ کیسے میرا جی چاہا تھا کہ میں اُس دیوان پر بیٹھوں، لیٹ جاؤں، الماریاں کھولوں، عربی فارسی اور ترکی میں لکھے گئے قلمی نسخوں کو دیکھوں۔ بلا سے میرے پلّے کچھ پڑے نہ پڑے۔ آئینہ دیکھے بغیر مجھے اپنی آنکھوں سے گرتی حسرت نظر آتی تھی۔ کاش میں وی آئی پی ہوتی تب شاید ان الماریوں کے پٹ کھل جاتے اور میں اُن شہ پاروں سے آنکھوں اور روح کی پیاس بُجھا سکتی۔

کچھ ایسے ہی حسرت بھرے الفاظ کا سیما نے اظہار کیا تھا۔

باب نمبر:۵ افطار کنوپی پر ترک پاکستان بحث مباحثہ

۱۔ سیکاریا کا نوجوان حمزہ پاشا ہندی مسلمانوں کی ترکوں سے محبت کی پوری تفصیل سے آگاہ تھا۔

۲۔ افطار کنوپی کے ٹیرس پر دونوں ملکوں کی فوج اور لیڈرز زیر بحث آئے۔

۳۔ بلند ایجوت جیسا درویش وزیراعظم تین کمروں کے فلیٹ اور ترکت اوزال کھٹارہ سی گاڑی میں سفر کرتا تھا۔

تھکن تو ہم دونوں کو محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اب اس کا علاج کیا تھا یہی کہ تھوڑی دیر بیٹھو، پھر اٹھو اور چل پڑو۔ تو یہی کچھ اس تیسرے صحن کے باغیچے میں پہنچ کر کرنے کا سوچا کہ تھوڑا سا ستا لیا جائے۔ بیگ میں رکھے خشک میووں کے پھکے مار لیے جائیں۔ حلوے کے ٹوٹوں سے منہ میٹھا کر لیں۔ کچھ ارد گرد گھومتے پھرتے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر دل پشوری ہو جائے۔

بغداد، مصطفٰے، مجید اور صوفہ کوشک کی خوبصورتیاں

ذرا تھم اے راہرو کہ پھر خوبصورت مقام آئے۔

یہاں قدم جامد اور آنکھیں منجمند ہوئی تھیں۔ ماربل ٹیرس پر افطار کنوپی سے باسفورس کا نظارہ آپ کی ساری حیات کو سحر زدہ کرتا ہے۔ نیلے شفاف آسمان پر چمکتے سورج کی تیز کرنوں میں باسفورس کا ڈھیرے ڈھیرے ہلکورے لیتا پانی حُسن و جمال کے کتنے رنگوں کا اظہار کرتا ہے۔ آبنائے کے دونوں کناروں پر قدم بہ قدم نیچے اُترتی خوبصورت عالیشان عمارتوں کا طویل سلسلہ، ہرے بھرے درختوں کی ہریالیوں سے جگمگاتا اس منظر کو انفرادیت دیتا ہے۔ گلاتا

ناور اس سین میں بے حد نمایاں اپنے نوکیلے سرے سے جیسے آسمان کے سینے میں بس چھید کرنے والا ہو۔

میں افطار کنوپی کی ایک قدم اونچی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی دیکھی گئی بغداد کوشک کی ساری جزئیات میری آنکھوں میں پھرنے لگی تھیں۔ کوشک Kiosk دراصل ترکی طرز تعمیر کی ایک اصطلاح ہے جس میں عمارت کے ساتھ باغ اور تمام اطراف سے اس باغ کے نظارے کی دید شامل ہوتی ہے۔

بغداد کوشک کے رنگ مشرق کا سارا حُسن لیے ہوئے ہیں۔ مراد چہارم جیالا اور شہ زور سلطان تھا۔ بغداد اور آرمینیا 38-1635 میں فتح کیے تو بغداد کا شاہی محل جیسے اس کی آنکھوں میں کھب گیا۔ بادشاہوں کے لیے اپنی خواہشات کو عملی شکل دینا کس قدر آسان ہے۔

اس بات کا اعتراف کرنے میں بھی مجھے کوئی عار نہیں کہ ہم جیسے چھوٹے لوگوں کے لیے ان خوبصورت چیزوں کو دیکھنا اور بار بار یہ سوچنا کہ کوشک کے وسطی کمرے کے گنبد کی ٹی پنک چھت اور اسکے ملحقہ محراب نما حصوں کی چھتیں واقعی سونے کی ہیں اور یہ کس قدر فضول خرچی ہے؟

کانسی کے آتش دان انوکھی ساخت کے۔ براؤن، نیلی اور سفید دلکش نقشین ٹائیلوں کی دیواریں جن کے عین درمیان میں قرآنی آیات سے سجی ایک نیلی پٹی سارے میں گردش کرتی تھی۔ کمرے کے عین وسط میں قالین پر ڈل تانبے کا فوارہ اور دودھیا شیشوں والی اوپر تلے کی دوہری رنگین نقش و نگار والی کھڑکیوں سے روشنی کے انعکاس کی جادوگری تحیّر آفرین تھی۔

باہر نکلنے سے قبل دروازے پر تحریر فارسی کے اِس شعر نے لطف دیا۔ دل نے بے

ساختہ(امین)بھی کہا۔

کشادہ باد بہ دولت ہمیشہ ایں درگاہ

بحق اشہد ان لاالہ الا اللہ

میری ٹانگوں میں شدید اینٹھن تھی ۔مقدس چیمبر کے بعد ہم لوگوں نے ایک ہی ہلّے میں ٹیرسڈ گارڈن پر بنے ہوئے سارے کوشک دیکھ ڈالے تھے ۔ٹانگیں میں نے لمبی پسارلی تھیں اس احساس سے بالا ہو کر کہ کوئی کیا کہے گا؟ پشت کو سلیب کی ریلنگ کے ساتھ ٹکاتے ہوئے شاہانہ حُسن و جمال اور خوبصورتیوں کے خمار سے بوجھل ماحول پر ایک بھرپور نظر ڈالی تھی۔

سیما بھی پاس آکر بیٹھ گئی ۔پستہ اور بادام کے ساتھ حلوے کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور بولی۔

یہ بقلاوے اور حلوے والا کام بڑا مزے کا ہے ۔تھوڑی سی مٹھاس سے توانائی بحال ہو جاتی ہے۔

ہم کھانے ،باتیں کرنے اور لوگوں کو دیکھنے جیسے دلچسپ شغل میں مصروف تھیں جب ہم نے اُسے دیکھا۔گلاب کی سی رنگت اور قدرے نیلی مائل چمکتی چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھوں والا دلکش لڑکا ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔میٹھی سی مسکراہٹ بکھیری تو میں نے ہتھیلی پر دھرے بادام اُس کی طرف بڑھائے ۔شکریے کے ساتھ اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے تعارف کروانے لگا۔

یہ سکاریا Sakarya کا حمزہ پاشا تھا۔ہمارے بارے میں جاننے پر کہ پاکستانی ہیں ۔اُس نے پاکستان اور ترکی کے درمیان پیار بھرے رشتوں کا ذکر جس محبت اور اشتیاق سے کیا۔اُس نے ہم دونوں کو اس کی طرف پوری طرح متوجہ کیا۔

پہلی بات تو ہم نے اُس سے سکاریا کے متعلق کی۔معلوم ہوا کہ ازمیر سے آگے کا شہر ہے۔

وہ اُس کہانی کی تفصیلی جزئیات سے آگاہ تھا جو ہندی مسلمانوں کی ترکی سے محبت کی غماز تھی۔

ہمیں بھی ہندی مسلمانوں کی خلافت بارے جذباتیت کا اچھا اندازہ تھا۔ہند کے علمائے دین،صاحب علم اور عام لوگوں کیلئے استنبول قبلہ و کعبہ سے کم عزیز نہ تھا۔معتبر ترین ہندی لوگوں کو دربار خلافت میں ہمیشہ پذیرائی ملتی۔برصغیر کی تحریک آزادی کے جیالے مولانا محمد علی اور شوکت علی کی والدہ بی اماں کا وہ مشہور زمانہ شعر خلافت پہ جان دے دو بیٹا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تڑپ اور اُسے بچانے کی کاوشیں اپنے محدود وسائل کے باوجود اُن کا گاؤں گاؤں،قریہ قریہ پھرنا،نعرے لگانا اور پیسہ اکٹھا کرنے کی تھوڑی بہت جزئیات سبھوں سے آگاہی اور شناسائی تھی۔

مگر اُس سے حمزہ پاشا سے سب سُننے کا اپنا مزہ تھا۔

حمزہ پاشا کا دادا اُس وقت ملّت بینک میں ملازم تھا۔ملّت بینک اپنے تاسیسی مراحل سے گزر رہا تھا۔ہندی مسلمانوں کا وفد سونا اور لاکھوں کی رقم لے کر جب ترکی پہنچا۔خلافت کی بساط اُلٹ چکی تھی۔اتاترک نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔اتاترک وفد سے ملا۔ان کے جذبہ محبت اور خلوص کا تہہ دل سے شکرگزار ہوا۔اُس کے حکم دینے پر ملّت بینک نے اُس عطیہ کو تاسیسی فنڈ میں جمع کرلیا۔

اب ظاہر ہے حمزہ پاشا ہمیں بہت پیارا اور اپنا سالگا۔اُس کے دادا کے بارے بھی ہم نے پوچھا۔وہ دنیا میں نہیں تھے۔

''خدا اُنہیں اپنی رحمتوں کے جوار میں رکھے۔''

میں نے محبت بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیری۔

حمزہ پاشا بڑی خوبصورت انگریزی بولتا تھا۔ حالات حاضرہ سے آگاہی رکھتا تھا۔ تاریخ سے دلچسپی تھی۔

''محبت کے رشتوں کے علاوہ کچھ خرابیوں میں بھی ہماری اقدار مشترک ہیں۔''

سیما ہنستے ہوئے گفتگو میں شامل ہوئی۔ مثلاً ہماری فوجوں کو سیاست سے بہت پیار ہے۔ اقتدار کے ایوانوں میں اپنے اپنے لُچ تلنے بیٹھ جاتی ہیں۔ ترکی میں چار مرتبہ فوج اقتدار پر قابض ہوئی۔ پاکستانی ترکی کو ہمیشہ سے رول ماڈل بنانے، سمجھنے اور آئیڈیلائز کرنے والے ہیں۔ انہوں نے اِس معاملہ میں بھی پیچھے رہنا پسند نہیں کیا۔ چوکے والا کوٹہ ہمارا بھی پورا ہوا۔ مقابلے اور موازنے تھے۔ نواز شریف بمقابلہ نجم الدین اربکان تھے۔

ایک ہُوک سی میرے دل سے اُٹھی تھی۔ ہمارے ذوالفقار علی بھٹو کی طرح ترکی کے اس منتخب وزیراعظم عدنان میندرس کا بھی فوج کے ہاتھوں عدالتی قتل ہوا تھا۔

سیما اور میں تیز رفتاری سے مقابلوں اور موازنوں کے گھوڑے سرپٹ دوڑا رہی تھیں جب حمزہ پاشا نے ہماری بات کاٹی۔

میرے خیال میں یہاں مجھے اُس فرق کو واضح کرنے کی ضرورت ہے جو ترک فوج کو بہر حال ایک قابلِ فخر امتیاز دیتی ہے۔ پہلی بات جو بہت اہم ہے کہ ترک ایک عسکری مزاج قوم ہے۔ ہر مرد شہری کیلئے فوجی تربیت لازمی ہے۔ ترک فوج معاشرے کا ایک حصّہ ہے۔ اور فوج چھاونیوں میں نہیں رہتی۔ جبکہ پاکستانی آرمی کا پس منظر بالکل مختلف ہے۔ گو اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے دنیا کی بہترین افواج میں سے ایک کہا گیا ہے۔ مگر اس کا مزاج کلونیل ہے۔ یقیناً اسکی وجہ ایک طویل مدت انگریزوں کا برصغیر پر قابض رہنے سے ہے۔

ترک فوج یا اس کے کسی ذیلی ادارے نے کبھی سول گروہوں کو مذہبی یا غیر مذہبی بنیادوں پر منظم نہیں کیا اور نہ کبھی کسی دوسرے ملک کے معاملات میں مداخلت کی۔

اُس پچیس چھبیس سالہ ترک نوجوان کو یوں اپنی فوج کی تعریف میں قلابے ملاتے دیکھا۔ سچی بات ہے بہت سی باتیں تو اُسکی درست تھیں۔ مگر کہیں وہ غلط بھی تھا۔ میں تھوڑی سی بے قابو ہوئی۔ منہ پھاڑ کر بول اٹھی۔

''ارے حمزہ پاشا میرے بچے تم نے اِن دو عورتوں کو کیا گاؤدی سمجھا ہے۔ میرے چند اتاریخ سے انہیں بھی بڑی دلچسپی ہے۔ یہ جو تم اپنی فوج کے اتنے قصیدے پڑھ رہے ہو تو مت پڑھو کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ فوج تھی جس نے 1960 سے 1995 تک پورے پینتیس سال میں چار بار اس ملک کے جمہوری نظام کا تیا پانچہ کیا۔

اور ہاں سُنو دائیں بازو کے مذہبی رجحان رکھنے والے انتہائی شریف النفس سے وزیر اعظم نجم الدین اربکان کو چلتا کیا۔ فوجی جرنیلوں نے اپنی مرضی سے تنسو چلر کو وزیر اعظم بنا دیا۔ تمہیں یقیناً علم ہوگا اس وقت پاکستان میں بےنظیر بھٹو وزیر اعظم تھیں۔

میرا سنگھ(گلا)کسی کھلے مُنہ کے پتیلے جیسا ہے۔ اطمینان اور تسلی سے بات کرنی آتی ہی نہیں۔ گھر میں بولتی ہوں تو تین گھر پرے لوگوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ بی بی بیگم گھر میں ہیں۔ یہ خوبی خاندانی ورثے میں پائی ہے۔ سُسرالی لتھاڑ بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ میاں کی لعن طعن بھی اصلاح کرنے میں ناکام رہی۔ اس وقت جوش و جذبات یقیناً عروج پر ہونگے کہ سیما کو پہلو دبانا پڑا" کہ آپے میں رہو۔ یہاں کوئی تقریری مقابلہ ہے کیا؟"

ویسے مجھے خود بھی محسوس ہوا تھا کہ جیسے میرے انداز میں ہلکا سا جارحانہ پن ہے۔ اسی لیے آواز کو لہجے کو پست کیا۔ اور جب بات کا سلسلہ پھر جوڑا مجھے اپنی آواز کا دھیما پن

خود محسوس ہوا تھا۔

مت بھولو اپنے بلند ایجوت جیسے سوشلسٹ وزیر اعظم جنہوں نے اِن فوجی جرنیلوں کے ہاتھوں قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے کو ترجیح دی مگر اپنے نظریات پر کوئی سودا نہیں کیا۔صدر سلیمان دیمرل سے بھی اچھی طرح آگاہ ہوں گے کہ کیسے کیسے ہتھکنڈے ان کے خلاف استعمال ہوئے۔

پھر ایک یاس بھری آہ میرے اندر سے نکلی تھی شاید اسی لیے میں خاموش ہوگئی۔مجھے اپنی محرومیوں کا احساس ہوا تھا۔میرا ملک جہاں امن نہیں۔صاف پینے کا پانی نہیں۔طبی سہولتیں نہیں۔تعلیم نہیں۔

''ہائے''میں نے دل میں کہا کتنے اور کس کس چیز کے رونے رووں۔کچھ دیر بعد جب بولی آواز میں بھراہٹ تھی۔

پاکستان اور ترکی میں بہرحال مقابلے والی کوئی بات نہیں۔پاکستان تو بیچارہ اپنی سالمیت کی جنگ لڑ رہا ہے۔کہیں فوج درمیان میں نہ آتی اور جمہوری عمل کو چلنے دیا جاتا۔جاگیرداری نظام کی بساط اول دن سے لپیٹ دی جاتی تو حالات یقیناً بہتر ہوتے۔اب تو جاگیردار،وڈیرے اور نواب اسے جونکوں کی طرح چمٹ کر اس کا خون چوس رہے ہیں۔

ترکی تو بہرحال خوش قسمت ہے کہ اسے اچھے اور مخلص لیڈر ملے۔فوج نے من مانیاں ضرور کیں۔سیاسی نظام کو معطل کرتے رہے۔تاہم ڈیفنس کالونیاں نہیں بنائیں۔مال نہیں سمیٹا۔

بلند ایجوت کو سلام جس نے تین بار وزارتِ عظمیٰ کا تاج سر پر سجایا مگر درویش رہا۔تین کمروں کے فلیٹ میں وزارتِ عظمیٰ کا وقت گزارا۔کھٹارہ سی فیٹ چلائی۔ایسا ہی وہ تیسرا بڑا لیڈر طورغت اوزال Turget ozal تھا۔دراصل جمہوری عمل میں تعطل اور

اچھے لیڈروں کا فقدان قوم کو بہت پیچھے لے جاتا ہے۔ تُرکی یوں بھی عظیم ترین سلطنتوں والا ماضی رکھتا ہے۔ کتنے بڑے تہذیبی او رثقافتی ورثے سے مالا مال ہے۔ رشک آتا ہے اس پر۔ خدا اسے سدا سلامت رکھے۔

حمزہ پاشا نے کچھ کہنا چاہا۔ جب میں نے اُسے روکتے ہوئے کہا۔ ہاں ہمیں اِس بات کا اعتراف بھی ہے اور دُکھ بھی کہ ہماری فوج کچھ اُلٹے پلٹے کاموں میں اُلجھ گئی ہے۔ اس کے ذیلی اداروں نے مذہبی گروپوں کو تقویت دی۔ کچھ ہماری بدقسمتی کولڈ وار کا لاوہ بھی ہمارے خطے میں پھوٹا۔ بڑی طاقتوں نے ہمیں استعمال کیا اور پھر ہمیں دھتکار دیا۔ اب اُن کے پالے ہوئے قاتل، مذہبی اور لسانی گروہ جن کی بہیمانہ دہشت گرد کارروائیوں نے ہمارے ماتھوں پر کلنک کے ٹیکے لگا دیئے ہیں۔ اور ہم اپنے ہی زخموں کو نوچ کھوسٹ رہے ہیں۔

حمزہ پاشا نے اُلجھنے سے گریز کرتے ہوئے کہا بہر حال اب ہمارے عوام بالغ ہو گئے ہیں۔ سیاست دانوں سے مل کر فوج کے خلاف صف آرا ہیں۔

''دعا کرو کہ ہمارے عوام بھی بالغ ہو جائیں۔ سیاست دان بھی پاک صاف ہو جائیں۔ پھر ستّے خیراں۔''

سکارایا آنے کی دعوت پر شکریہ ادا کیا کارڈ لے کر پرس میں رکھا۔ سوچا چلو استنبول سے تو فارغ ہوں پہلے۔ چار دن ہو گئے ہیں آدھا بھی نہیں دیکھ پائے۔

تھوڑی سی منہ ماری تھوڑے سے آرام اور تھوڑی سی بحث مباحثہ نے تازہ دم کر دیا تھا۔

مصطفےٰ کوشک بھی کیا لاجواب چیز تھی۔ دیواریں گلابی، نیلی اور سبز۔ سنہرے نقش و نگار سے مزّین چھت اور اطراف آرام دہ صوفوں سے سجی ہوئیں۔

میں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر کے اُن تمام رنگوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ جو میں ابھی ابھی دیکھ کر آئی تھی۔

ٹیرسڈ گارڈن دراصل تیسرے کورٹ یارڈ کی آگے بڑھی ہوئی صورت ہے۔ مجید کوشک 1850 میں عبدالمجید نے تعمیر کروایا۔ یہ آرمینیائی اور بلقانی طرزِ تعمیر کی انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب عمارت ہے۔ جسے اب میوزیم اور ریسٹورنٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اُنیسویں صدی کے آغاز تک یہ عمارت سلطان کے معزز مہمانوں کی خاطر مدارت اور خود سلطان کی استراحت کے لیے استعمال ہوتی رہی تھی۔

ریسٹورنٹ میں ٹرکی قہوے نے ہمیں تازگی دی۔ کافی پینے کو جی تو بہت چاہا مگر بلڈ پریشر کا خوف مانع تھا۔ قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے یونہی میں نے نوٹس والی کاپی کھول کر دیکھی۔

صوفہ کوشک بھی بغداد کوشک کی طرح سلطان کی متعدد مصروفیات مثلاً اسکے مطالعہ کرنے، موسیقی سننے اور آرام کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ میں نے اس کوشک کی خصوصیات پر غور کیا۔

مجھے ہنسی آ گئی تھی سب کچھ گڈمڈ سا ہو رہا تھا۔

''ایک چکر اور نہ لگائیں۔''سیما کی جانب میں نے دیکھا۔

سیما چلنے میں شیر کی بچی ہے۔ فوراً کھڑی ہو گئی۔

مجید کوشک کا یہ رخ جواب دیکھنے میں آیا تھا بہت منفرد تھا۔ مرمرا سمندر کا نظارہ، اندرونی سنگ تراشانہ حُسن، مرمرا کو سلامی دیتا اسکا ماتھا سب کا حُسن لاجواب تھا۔ بغداد پویلین میں ایک بار پھر گھسے۔ ٹائیلوں میں پھولوں کے متعدد ڈیزائنوں کو دیکھا اور سراہا۔ بالکونیوں سے نیچے پھیلے ہوئے جھاڑ جھنکار کے جنگلوں کے گرداگرد فصیلوں اور بُرجوں کا

سلسلہ بھی تاریخ کے بہت سے باب کھول رہا تھا۔شاہان بازنطینوں کے محلات بھی یہیں تھے۔ 1261 میں بنی ہوئی موجودہ دیوار پالیوموکوس نے تب بنوائی تھی جب اُس نے لاطینیوں سے یہ پایہ تخت چھینا تھا۔

میرے عقب میں کھڑا گائیڈ کسی ٹورسٹ ٹولے کو بتا رہا تھا۔میں نے سُنا اور دیوار کو گہری تنقیدی نظروں سے دیکھا۔

وہ بھی کیا لوگ تھے۔جن کے تعمیراتی سامان بھی فولادی عناصر رکھتے تھے۔جذبوں میں بھی فولاد کی آمیزش تھی کہ اُن کی بنائی ہوئی چیزیں صدیاں گزر جانے اور موسموں کی تلخیاں سہنے پر آج بھی اپنے ہونے کا اظہار شدّ ومد سے کرتی ہیں۔

یہیں عین بغداد کوشک کے بالمقابل sunset کا دیدہ زیب چیمبر تھا۔ایک بڑے کمرے اور اس میں چھوٹے سے باتھ روم کی تعمیر سولہویں صدی میں اور اس کی بیرونی تزئین و آرائش حبیب نامی ایرانی ماہر سرامکس کے ہاتھوں ہوئی۔سلیم اول نے جب تبریز فتح کیا تو اُس نے حبیب جیسے کئی ماہرین آرٹسٹ استنبول بھیجے جنہوں نے اس کی خوبصورتی کو اور چار چاند لگائے۔

''اللہ کتنے جیالے تھے یہ عثمانی بھی۔ایسے تو بلقانی ماؤں نے اپنے بچوں کو ڈرانے کیلئے کہاوتیں نہیں گھڑی تھیں۔ایسے تو نہیں کہا جاتا تھا۔ترکوں کے گھوڑے جس زمین پر اپنے سم دھر دیں وہاں گھاس نہیں اُگتی۔

یہ چیمبر جتنا خوبصورت تھا اسکی تاریخ اتنی ہی خونی تھی۔یہاں محمد سوئم نے اپنے اُنیس بھائیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔دراصل اسی چیمبر میں شہزادوں کی رسم ختنہ ہوتی تھی۔بیچارے اُن معصوموں کی بھی پہلے رسم ختنہ ہوئی پھر گلے گھونٹے گئے۔

تو یہی وہ چیمبر ہے۔رات کو جس کے بارے میں پڑھتے ہوئے میرے سارے

سر پر میں خوف کی لہروں نے گردش کی تھی ۔

یہ بادشاہوں کی تاریخ اتنی گھناؤنی کیوں ہے؟ ان کے سینوں میں دل کی بجائے شاید پتھر ہوتے ہیں ۔

ٹیرس گارڈنز کے وسط میں ہیڈ فزیشن ٹاور میں جہاں سلطانوں کی جنسی قوت بڑھانے کے لیے کشتے اور مربع جات تیار ہوتے تھے وہیں سلطان کے ناپسندیدہ افراد کے لیے زہر کی بھی تیاری ہوتی ۔

''پروردگار ان شاہوں کو بھی کیا کیا نفسیات ہے ۔'' سیما نے جھرجھری لی تھی ۔

''شاہوں کی نہیں ۔ طاقت اور اقتدار کی کہو ۔'' میں نے کہا ۔

بیچارے سلطان ابراہیم کا تو بچ بچاؤ شاید اسی لیے ہو گیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بیمار تھا وگرنہ تو مراد چہارم نے اُس کا بھی یونہی بیڑہ پار کرنا تھا ۔

افطار کنوپی

ماربل ٹیرس پر آ کر ٹیولپ گارڈن کی خوبصورتی سے آنکھوں کو تسکین دینا بھی تو ایک عیاشی تھی ۔ سلیم سوئم گل لالہ کا دیوانہ تھا ۔ اُس نے اپنے دور میں محل کو ٹیولپ سے سجا دیا تھا ۔ ماربل ٹیرس پر بڑی مذہبی، رنگین اور رومانوی محفلیں سجتی تھیں ۔ رمضان کے مہینے میں اسی ٹیرس پر شاہی خاندان افطاری کرتا ۔

بہار کے دنوں میں جب گل لالہ کے پھول اپنے جوبن پر ہوتے ۔ باسفورس اور مرمرا کے نیلے پانیوں پر چمکتے چاند کی دودھیا اور طاقچوں میں لو دیتی زردئی روشنیاں بکھرتیں ۔ ٹیرس پر موسیقاروں کی دلنواز دُھنوں کی تانیں اُڑتی ۔ گل لالہ کے پھولوں پر تیرتی بہار کی ہواؤں میں نشہ سا گھل جاتا ۔ تب حرم سرا کی پری چہرہ کنیزیں اطلس و کمخواب کے پہناووں میں لپٹی سولہ سنگھار کیے یہاں وہاں ادائیں دکھاتی رقص کرتی خود کی نمائش کرتی

پھرتی تھیں۔ایسے میں اگر کسی پری زاد کی کسی ادا نے دنیا کی اس عظیم سلطنت کے فرمانروا کے دل کے کسی تار کو چھولیا۔تو گویا خوش نصیبی کا ہما اس کے سر پر بیٹھ گیا۔

نیلے شفاف آسمان کے نیچے بہتے باسفورس کے پانیوں کو دیکھتے ہوئے کتنی کہانیاں یاد آئی تھیں۔خواجہ سراؤں کے چٹخارے دار قصے۔دودھیا رنگے خواجہ سرا تو ے کی کالک جیسے رنگوں والے خواجہ سرا۔سلامیلیک اور حرمیلیک میں ان کے کردار آختہ (خصّی) کرنے کے طریقے۔رات توپ کپی پر claire karaz کی خریدی ہوئی کتاب پڑھتے ہوئے حرم کی عورتوں کی نیم برہنہ حالتِ استراحت۔تالاب کے اندر اور باہر نہانے اور موج میلوں کے منظر اور جابجا پتھروں کی طرح ساکت کھڑے ہوئے سیاہ فام خواجہ سراؤں کی تصویریں اندر کی کتنی کہانیاں سنا رہی تھیں۔ایک منظر دنیا کے شہرہ آفاق موسیقار بیتھووین Beethoven کا تھا جہاں وہ حرم کی عورتوں کو موسیقی کا سبق دے رہا تھا۔فصیل کی ان دیواروں کے اندر کہاں کہاں کا حُسن نہیں آتا تھا۔روسی،یوکرائنی،کاکیشائی،مشرقی یورپ کے مفتوح علاقوں سے ہر اچھا چہرہ چھانٹ لیا جاتا تھا۔سازشوں اور محلاتی توڑ جوڑ کی داستانیں۔بے وفائی کے کسی معمولی سے جرم پر باسفورس کے پانیوں کو اُنکا مقدر بنادینا۔

ہائے کیسے کیسے قصے اور کیسی کیسی کہانیاں یاد آئی تھیں۔

کونسل ہال یا چیمبر آف پٹیشن

یہ تحفہ ہم نے واپسی پر دیکھا۔تھا تو وہیں تیسرے صحن میں۔مگر دیکھنے سے رہ گیا۔یوں تو بے شمار چیزیں رہ گئی تھیں۔سیاحوں کی کثرت جس انداز میں یہاں وہاں گھوم پھر رہی تھی وہ اس کی کچھ خصوصیت کو نمایاں کرتی تھی۔اور واقعی سچ یہی تھا کہ نظریں جدھر اُٹھتیں واپسی کا راستہ بھول جاتیں۔پھر بہت سے منظروں سے لڑھکتی لڑھکاتی طلائی میناکاری سے سجے دروازے پر رک گئیں جو اس وسیع وعریض مستطیل نما کمرے کو دو حصوں

میں تقسیم کرتا ہے جو چیمبر اف پٹیشن یا کونسل ہال کہلاتا ہے۔ بائیں طرف کا کمرا وزراء کے لیے اور دائیں طرف کا کمرا ان کے لیے جو انصاف کے خواہاں ہوتے۔ بائیں طرف کی گزرگاہ کے عین اُوپر جس کے نیچے وزیر کی نشست ہوتی۔ سلطان دیوار میں بنی شیشے کی جڑاؤ کھڑکی میں بیٹھا ساری کاروائی کو دیکھتا اور جہاں ضروری سمجھتا مداخلت کرتا۔ اکثر ڈاج والے انداز اپنائے جاتے۔ بعض اوقات اُسکی موجودگی کا علم اُس وقت ہوتا جب وہ کسی متنازع معاملے پر مداخلت کرتا۔

دنیا کے سرکردہ لوگوں اور سفیروں کو اس کمرے میں آنے، یہاں رکھے گئے صوفوں پر بیٹھنے اور سلطان کی جانب سے اذن ملاقات پانے کے لیے گھنٹوں انتظار کے کرب سے گزرنا پڑتا تھا۔ خاص الخاص خادم انھیں بازوؤں سے تھام کر دروازے میں سے گزارتے جہاں قریب قریب دوہری کمر کے ساتھ اُن کا پہلا جھکاؤ ہوتا۔ کمرے کے وسط میں دوسرا، اور ہیرے جواہرات سے جگمگاتے تخت پر آلتی پالتی مارے بے حس و حرکت بیٹھے سلطان کے حضور پیش ہونے پر گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے اُسکی عبا کو بوسہ دینا اور عین اسکے قدموں میں سر کو جھکانا تیسرا عمل تھا۔ شرف باریابی کے بعد واپسی اُلٹے قدموں ہوتی۔ سلطان کی جانب پشت کیے بغیر۔

سلطنت عثمانیہ کے مسلمان ترک سلاطین کو ایسا کرنے کا حق حاصل تھا۔ اُنکی بادشاہت سترھویں صدی کے آخر تک یورپ میں دریائے ڈینیوب کے کنارے ہنگری، رومانیہ، پولینڈ سے لے کر یونان تک سارا مشرقی یورپ، روس میں یوکرین، کریمیا، قفقاز، آذربائیجان، ایشیا میں ایشیا کوچک کے بعد عراق، شام اور جزیرہ نما عرب تک سارے علاقے، افریقہ میں مصر، سوڈان، لیبیا، تیونس، الجزائر، مراکش تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ہندوستان میں یہ اورنگ زیب کا زمانہ تھا۔ اُنکے اقتدار کا سورج نصف النہار پر

تھا۔کسی یورپی طاقت کی مجال نہیں تھی کہ وہ اس کے مقابلے پر ٹھہر سکے۔

تسکین دینے والی روح تک کو فرحاں وشاداں کرنے والی تفصیلات کتنی دلچسپ تھیں۔کبھی کے دن بڑے،کبھی کی راتیں۔کم از کم تاریخ کے صفحات تو گواہ ہیں کہ کبھی ہمارے بھی دن روشن اور بڑے تھے۔ہم بھی کسی گنتی شمار میں تھے۔

بڑا لمبا سانس تھا جو ہم دونوں کے اندر سے اوپر آیا تھا۔

کانسی کے آتش دان انکی ساخت اور کٹاؤ کا کام چھت کے گنبد میں لٹکتا سونے کا پینڈل اسمیں جھولتا پھندنا۔اُوپر سے تاریخ کا بوجھ۔اب بھلا دماغ نے گھومنا نہیں تھا اور کیا ہونا تھا۔مجھے تو لگتا تھا جیسے ابھی چکرا کر گر پڑیں گے۔میں سیماں کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئی تھی۔

کونسل ہال کے ساتھ ہی ٹاور آف جسٹس تھا۔طویل قامت والا جس کے شیشے کی کھڑکیوں والے کیبن میں بیٹھ کر کبھی کبھی سلطان کا اپنے محل اپنی سلطنت کو دیکھنا بھی ایک مشغلہ تھا۔

اور جب ہم اسی یارڈ میں امپیریل (Treasury) کی طرف بڑھ رہے تھے۔میں نے سیما سے اس حد درجہ نالائق طالب علم کی طرح کہا تھا کہ جس نے شاہوں کو لعن طعن کرتے ہوئے جملہ کسا تھا۔

خود تو مر گئے اور ہمیں سیاپے میں ڈال گئے۔

''یہ شاہ بھی کیسے انسان تھے خسروانہ شان وشوکت کے ناسٹلجیا میں گرفتار۔''

''ارے میری جان وہ تو خیر شاہ تھے یہاں تو مارے مونے نہیں مان۔کسی کے پاس چار پیسے آجائیں تو پھر اس کی اترا ہٹیں دیکھو۔چلو یہ تو کل اگر خود شان سے جیئے تو آج ملک کے لیے بھی بہت کچھ چھوڑ گئے کس قدر سیاح ہے یہاں اور کتنی آمدنی ہے انہیں۔

سیما ٹھیک کہتی تھی ابھی جب ہم رات کولٹریچر دیکھ رہے تھےتو اندازہ ہوا کہ تقریباً چھ ہزار لوگ ہر روز اسکی سیاحت کیلئے آتے ہیں۔

تھکاوٹ شدید تھی۔ میں ہرگز ہیروں جواہرات کے اِس چیمبر میں داخل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ سیما ہیرے پہننے والی ہیروں کی شوقین تھی۔ تھکن سے مر رہی تھی مگر اس کیلئے اندر جانا ضروری تھا۔ اس کا تعاقب کرنا پڑا۔ پہلے حصے میں ملبوسات کی نمائش تھی۔ کلر سکیم، ڈیزائننگ، کپڑا، سبھی کھلم کھلا اپنی عالی نسبی کا اعلان کرتے تھے۔ شلواریں اور کفتان تو ہمارے ہاں 60 کی دہائی میں رواج پانے والی اے لائن شرٹس جیسی ہی تھیں۔ پر ہیروں سے مرصع سلاطین کے لباس فاخرانہ سے بندھے خنجر تو فی الوقع ایک عجوبہ تھے۔

جب آگے بڑھے تو تخت دیکھ کر گنگ ہو گئے۔ خدا جانے کون کون سے نادر ہیرے اور جواہرات شاہ اسمٰعیل صفوی کے اس تخت میں جڑے ہوئے تھے جو سلیم اول کے عہد میں ایران سے آیا تھا۔ ہم نے تو کہانیوں میں ہی پڑھا تھا۔ بادشاہ تخت پر بیٹھا تھا۔ دائیں بائیں درباری ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ تو اب جان پائے کہ تخت ایسے ہوتے ہیں جن سے پھوٹتی جواہرات کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ شہزادوں کے جھولے اور تاج۔ اللہ جانے کیا کیا چیزیں تھیں؟ مجھ جیسی ننگی بُھکی عورت کو اختلاج ہونے لگا تھا۔

سیما میرا تو جی چاہتا ہے تمہیں دھکا دے دوں۔ شیشے توڑتی ہوئی تم سیدھی جا کر اُس تخت پر بیٹھ جاؤ جو آبنوس و صندل کی لکڑی کا ہے اور جسکے بارے میں تم پڑھ رہی ہو کہ یہ ایرانی نہیں عثمانی ہے۔ قیمتی ہیرے موتی اسمیں جڑے ہیں۔ مٹھی بھر اُتار کر اپنی جیب میں ڈال لینا۔ تسکین ہو جائے گی تمہاری۔

کمبخت سیما پیچھے مڑتے ہوئی ہنسی۔

''مجھے تو تخت پر بٹھا دو گی پر خود تختے پر لٹک جاؤ گی۔ ترکی کی سیکولر حکومت کے ہاتھ ایک

دہشت گرد آجائے گا۔اچھی ناموری ہوجائے گی تمھاری تو۔‘‘

حرم اُس دن بند تھا۔لٹریچر پڑھنے سے ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ وہ بھی ایک پرسرار دنیا ہے۔
جسے دیکھنے کیلئے پورا ایک دن چاہیے۔

باب نمبر:٦ لٹنا میرا استنبول کے کیپلی کاری میں

۱۔ چار گھنٹے ہم کریمنل اور ٹورزم پولیس کی گھمن گھیریوں میں گیند کی طرح لڑھکتی پھریں۔

۲۔ استنبول میں بسنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کے ذہن کیا اُس عالمی پروپیگنڈے سے متاثر ہیں جو اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دنیا میں جاری ہے۔

دوسو چوراسی لیرے تین دن چلے تھے۔چوتھے دن توپ کپی سرائے میوزیم کی آرمینیائی طرز تعمیر کی خوبصورتیوں، پچّی کاری و تزئین کاری کی ہوش رُبا رنگینیوں سے طلسم زدہ سے باہر آئے تو ٹانگیں ٹوٹنے کے قریب تھیں اور کسی بینک کو کھوجنے کی ہمت نہ تھی۔یوں بھی ترک انگریزی بولنا پسند نہیں کرتے۔آتی بھی ہو تو ٹھینگا دے جاتے ہیں۔مونڈھے مار کر چہرے پر ایسے تاثرات بکھیرتے ہیں کہ بندہ حیران سا ہو جاتا ہے۔

اُس وقت (body language) کے استعمال پر میری طبیعت قطعی آمادہ نہ تھی۔اور گرینڈ بازار سے ملحقہ منی چینج آفس کا لڑکا انگریزی سمجھتا تھا۔اس لیئے وہیں پہنچے۔

پیارا سا خوش شکل لڑکا دیکھ کر ہنسا۔سو ڈالر کا نوٹ سوراخ سے اندر گیا۔پیسے لیے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل آ گئے۔

ہوٹل کے سامنے رُک کر جب ادائیگی کیلئے میں نے پرس کھولا تو تہہ کیے ہوئے سارے لیرے ہاتھ میں آ گئے۔میں نے انہیں کھولا۔ٹیکسی ڈرائیور نے ہلکے نیلے رنگ کے

ایک نوٹ کو چھونا چاہا تو میں نے بھی اسکا نوٹس لیا ۔یہ نامانوس سا نوٹ تھا۔میں نے نوٹوں کو مُٹھی میں بند کرلیا۔ سیماں کو ادائیگی کیلئے کہا اور بدحواس سی دروازہ کھول کر باہر آگئی۔خوشگوار ٹھنڈی ہوا نے میرے اڑتے حواسوں کو ذرا معتدل کیا۔ہوٹل کے ریسپشن پر کھڑے لڑکے کو نوٹ دکھائے ۔اس نے نیلے نوٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو متروک ہو چکا ہے۔''

''ہیں''

میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں اور یہ سوچنا چاہا کہ کاونٹر پر پیسے لیتے وقت میں نے انہیں دیکھا تھا کیا؟

اور یہ کس قدر حیرت انگیز بات تھی کہ مجھے اپنی ذہنی سکرین پر اپنے چیسٹ بینک سے سو ڈالر کا نوٹ نکالنے کا عمل اپنی پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔منی چینج آفس سے ملحقہ وہ چھوٹی سی خالی جگہ،کیش کاونٹر تک جانے لڑکے کے ہنسنے،نوٹ دینے اور لینے کے سب مراحل متحرک تصویروں کی مانند سامنے تھے۔

پر اگلے منظر پر دبیز دُھند تھی۔

اب بہت سے سوال تھے جو میرے ذہن میں اُبھرے۔

میں نے نوٹوں کو ہاتھ میں پکڑا۔ کیا گنا تھا؟ کیا مجھے اُن میں کوئی خاص چیز نظر آئی ؟لیروں سے تو میں پہلے ہی دن شناسا ہو گئی تھی۔

عجیب بات تھی میری ذہنی سلیٹ صاف تھی اور اُس پر ان میں سے کسی کا جواب نہیں تھا۔ میں گُم سُم سی کھڑی تھی ۔ایک سوتیں لیروں کے ساتھ ہاتھ ہو گیا تھا۔گویا تقریباً پانچ ہزار پاکستانی روپے کو ٹھک لگ گیا تھا۔جاپان اور تائیوان کے سیاح لاونج میں میرے قریب ہی کھڑے اس مسئلہ کو خاصی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔اُن میں سے کسی نے کہا۔

''فوراً پولیس اسٹیشن رپورٹ کریں۔''

''میں اگر لڑکے کے پاس جاؤں تو''۔۔۔۔۔میں نے ریسپشنسٹ کی رائے لی۔ اس کا بڑا حتمی جواب تھا۔

''یہ زیادہ مناسب ہے پولیس کو رپورٹ کریں۔''

اس استفسار پر کہ پولیس اسٹیشن کہاں ہے؟ تائیوانی نے چھوٹا سا بازو پھیلا کر لاؤنج کے کونے کی طرف یوں اشارہ دیا جیسے پولیس اسٹیشن تو یہیں اسی کونے میں ہی ڈیرے ڈالے بیٹھا ہے۔ میں بھی حد درجہ احمق اور گھامڑ عورت کہ ساتھ چلنے کی درخواست کر بیٹھی۔ اُس نے تو بھڑا سا چہرہ فی الفور نفی میں ہلا دیا۔

میں اور سیما اب اس نئی مہم پر نکلیں۔ پوچھتے پُوچھاتے جب جائے مقررہ پر پہنچیں۔ اس وقت ایا صوفیہ اور جامع (مسجد) سلطان احمد کے نوکیلے مینار زرفشاں کرنوں میں چمک رہے تھے اور دونوں تاریخی جگہوں کے درمیان پارکوں میں ٹورسٹوں کے پُرے مست خرام تھے۔ پولیس اسٹیشن میں سناٹا تھا اور ایک بے حد خوبصورت نوجوان ایک کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔

سلام کے جواب میں تپاک تھا۔ پاکستان کا جان کر لہجے میں محبت کا اظہار تھا۔ میں نے مسئلہ گوش گزار کیا تو سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔

''کیا وصولی کی کوئی رسید لی تھی۔'' میں نے ہونقوں کی طرح دیکھا اور سر نفی میں ہلایا۔

دوسرا سوال ہوا۔''جگہ پہچانتی ہیں۔ آدمی کو شناخت کر لیں گی؟ دونوں سوال ظاہر ہے ایسے تھے کہ میرا جواب جوشیلی قسم کی ''ہاں'' میں تھا۔

''گھبرائیے نہیں آپ کے پیسے ضرور آپ کو ملیں گے۔''

پُریقین لہجے سے چھلکتی اُمید کی آس نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔

''مگر''

میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا۔

''چوں کہ یہ criminal case ہے۔آپ کو کریمنل پولیس اسٹیشن جانا ہوگا۔ یہ تو ٹورزم پولیس اسٹیشن ہے۔بیازت یہاں سے زیادہ دور نہیں۔قریب ہی ہے۔''

اور جب وہ وا کی ٹا کی پر غالباً بیازت والوں کو میرے بارے میں بتا رہا تھا میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

''ارے میں کون ہوں؟ ٹورسٹ نہیں۔''

اس وقت مجھے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ جیسے میں لاہور کے نولکھا پولیس اسٹیشن میں بیٹھی ہوں اور مجھے یہ کہا جا رہا ہے کہ محترمہ یہ کیس تو رنگ محل پولیس کا ہے۔وہاں جائیے۔

گاڑی کے لیے معذرت ہوئی۔ٹیکسی منگوا دی گئی اور یہ بھی تاکید ہوئی کہ اسے صرف پانچ لیرے دینے ہیں۔اس وقت مجھے پھر اپنی پولیس اس گمان کے ساتھ یاد آئی تھی کہ وہ یقیناً ایک غیر ملکی خاتون کو ٹیکسی میں رولنے کی بجائے گاڑی میں بھیجتی۔

ماشاءاللہ سے ٹیکسی ڈرائیور نے ہیرا پھیری میں پاکستانیوں کو بھی مات کر دیا تھا۔ اللہ جانے کن کن راستوں پر بگٹٹ بھاگا اور میٹر بڑھائے چلا جاتا تھا۔جونہی ایک چوک پر گاڑی رُکی۔ ''تاکسیم Taksim'' پر نظر پڑی۔سیماں نے بے اختیار اپنے گھٹنے پر دو ہتھڑ مارا۔

''دیکھو تو ذرا تاکسیم پر لے آیا ہے۔یہاں بیازت کہاں؟'' وہ غصے سے چلائی تھی۔

تاکسیم بیاگلو Beyoglu کا مرکزی چوک ہے جہاں سے مختلف جگہوں کو

راستے نکلتے ہیں۔ ہاتھوں میں نقشے پکڑ کر صبح سے شام تک بسوں اور ٹراموں میں جُھل خواریوں سے ہمیں شہر کے چہرے مہرے سے خاصی جان پہچان ہوگئی تھی۔ میٹر پچیس لیروں کی نشاندہی کر رہا تھا۔

پر اس کا فائدہ۔ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ ہماری بکواس کا اس پر کچھ اثر نہیں تھا۔ باہر رات تاریک اور بتیاں روشن تھیں۔

پھر ایک جگہ گاڑی روک کر اُس نے سامنے بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت 34 لیرے روز روشن کی طرح میٹر پر جگمگا رہے تھے۔ ہم ٹیکسی سے اُترے۔ پانچ لیرے کا نوٹ میں نے فرنٹ سیٹ پر پھینکا اور جی داری سے کہا۔

تم ہم پاکستانی عورتوں کو ہرگز بیوقوف نہیں بنا سکتے ہو۔ ہمیں یہی دینے کو کہا گیا تھا۔"

بعد کے سالوں میں جب میں کہیں پیٹرزبرگ میں روسی بوڑھی عورتوں کے ہاتھوں لٹی۔ جنہوں نے میرا ایک طرح مل کر گھیراؤ کر لیا تھا۔ اُس دن مجھے بے اختیار وہ ترک ڈرائیور یاد آیا تھا۔ شریف تھا بے چارہ۔ اُتر کر ہمیں گاٹے سے پکڑ لیتا تو چونتیس 34 لیرے کیا سو لیرے دے کر جان چھڑواتے۔

سیما کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے میں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

سیڑھیاں شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھیں۔ استنبول کا سارا شہر کم بلندی والی ڈھلانی پہاڑیوں پر ایک مربوط اور خوبصورت ترتیبی صورت میں بکھرا ہوا ہے۔

برآمدوں اور راہداریوں کے چکر کاٹتے ہوئے مطلوبہ جگہ پہنچے۔

پولیس افسر نوجوان تھا۔ خوبصورت تھا۔ اب میری داستانِ امیر حمزہ پھر شروع

ہوئی۔ یہ بھی مقام شکر تھا کہ اُس کے پاس انگریزی کا تھوڑا سا دال دلیہ تھا۔ تفتیشی سوالات ہوئے۔ ماشاءاللہ سے ہاتھ، آنکھیں، زبان سب چلیں۔ یوں معاملے نے فہم وفراست کی منزلیں طے کیں۔ نتیجہ جو سُنایا گیا وہ کچھ یوں تھا کہ چونکہ اب رات کے آٹھ بج رہے ہیں اور آفس بند ہو گیا ہے۔ لہذا کل نو بجے تشریف لائیے۔ ہر طرح کی مدد کی جائے گی۔

اُترائی کی مشقت اور ٹرام اسٹیشن تک پیدل چلنے کی صعوبت جھیل کر ہوٹل پہنچنے تک کے وقفے میں مجھے دو تین بار یہ خیال آیا کہ دفع کرو۔ گولی مارو اس قضیے کو۔

پر بستر پر لیٹنے اور تھوڑا سا ستا لینے کے بعد میرے اندر کا کہانی کار اور سیاح اسے حتمی انجام تک پہنچانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

''بھئی دیکھو تو ہوتا کیا ہے؟''

صبح ناشتے کے بعد میں نے بالوں میں کنگھا چلایا۔ جُوتا پہنا۔ رات کے پہنے ہوئے کپڑوں کی سلوٹوں اور شکنوں کو ہاتھوں سے قدرے صاف کیا۔ بیگ کندھے سے لٹکایا اور سیما سے یہ کہتے ہوئے ''کہ میں ذرا پولیس اسٹیشن بھگتا آؤں تب تک تم تیار ہو جانا۔''

سیما پوری بیگم ہے۔ نِک سک سے آراستہ ہوئے بغیر باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔

نو بجے جب میں مطلوبہ جگہ پہنچی۔ ماشاءاللہ سے سیٹ پر ایک نیا چہرہ بیٹھا تھا۔ دو نوجوان لڑکے کسی بات پر زور زور سے بول رہے تھے۔ تھانے والا تو ماحول ہی نہیں تھا۔ اُن سے فارغ ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

اب میرا بیان شروع ہوا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر ممکنہ سوالوں کے جواب بھی اس میں شامل کر دیئے کہ فضول کی تفتیشی تکرار سے جان چھٹے۔

پر جونہی خطابت کے عمل سے فارغ ہو کر میں نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا۔ میرا جی اپنا

سر پیٹ لینے کو چاہا کہ میں اتنی دیر سے بھینس کے آگے بین بجارہی تھی ۔وہ چہرے کے بائیں رُخ کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹکائے بٹر بٹر میرا منہ دیکھتا تھا۔''ہائے وے میریا ربا''اس وقت جی تو چاہا کہ یا تو اُسے ایک تگڑی قسم کا جھانپڑ دوں یا پھر ایک زوردار اپنے سر پر ماروں ۔اور میں نے مارا پر سر پر نہیں پاؤں پر ۔اٹینشن والے انداز میں پاؤں نے فرش بجایا اور گلے سے نکلتی کرخت آواز نے چھت پھاڑی ۔

''ہے یہاں کوئی جو میری بات سُنے ۔''

فوراً ہی سامنے والے بند دروازوں میں سے ایک دروازہ قدرے زوردار آواز میں کھلا اور ایک لڑکی بھاگنے کے سے انداز میں میرے سامنے آ کر بہت شُستہ انگریزی میں بولی ۔

''بتایئے کیا بات ہے؟''

میری بولتی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔آنکھیں ، ناک ،ہونٹ ،صراحی دار گردن سے نیچے لشکارے مارتا اُس کا قدرے عریاں سینہ، ننگے سڈول بازو اور سرو جیسا قد میری آنکھوں میں فٹ ایکسرے مشین میں سے ہو کر گزرا ۔

''اللہ یہ کمبخت اِس حُسنِ جہاں سوز کے ساتھ پولیس اسٹیشن پر کیا کر رہی ہے ۔اسے تو کہیں کسی بغداد کوشک ،کسی مجید کوشک میں ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا تھا ۔

لڑکی پھر بولی ۔

''بتایئے کیا مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ تو بعد میں بتاؤں گی پہلے تمہارے حُسن کو سراہ تو لوں ۔''

لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔اور مجھے یوں لگا جیسے بند کلیوں نے چٹک کر اپنے منہ

کھول لیے ہوں۔

حُسن کی فسوں خیزی سے نکلی تو اصل مسئلے کی طرف متوجہ ہوئی۔ چلیے جناب کہانی پھر دہرادی گئی۔

اُس نے یوں چٹکی بجائی جیسے انگلیوں کی پوروں میں طلسماتی جن مقید ہو۔

''ابھی یہ پولیس مین آپ کے ساتھ جائے گا اور سارا مسئلہ حل کرآئے گا۔ ذرا بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے پولیس مین کو دیکھا جو ہمارے پاس ہی کھڑا تھا اور جس کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ چُوچہ سا، میرے سکول کے دسویں جماعت میں پڑھنے والے لڑکوں جیسا جن کی مسیں ابھی بھیگتی ہی ہیں کہ وہ جوان دکھنے کے چکر میں گالوں اور ہونٹوں کے بالائی حصوں کو بلیڈ سے چھیل ڈالتے ہیں۔

میں نے بہت لمبی سانس بھری تھی جس میں میری کل شام سے لے کر اب تک کی مشقت کا درد رچا ہوا تھا۔

قہر درویش بر جان درویش اس کے ساتھ چلنے کے سوا کوئی اور چارہ کار تھا کیا؟ سو چلی۔ بلڈنگ کی سیڑھیاں اُترنے کے بعد جب وہ مجھے اُس کھلی جگہ پر لایا جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں مجھے سوفیصد یقین تھا کہ وہ مجھے گاڑی میں بٹھائے گا اور گاڑی شور مچاتی، ہوٹر بجاتی، ہٹو ترکوں راستہ دو، کا عملی مظاہرہ کرتی گرینڈ بازار میں داخل ہو کر منی چینج آفس کے سامنے رُکے گی۔

''واللہ کس قدر مسرّ ورکُن نظارہ ہوگا۔'' میں نے تصور میں اس منظر سے حظ اُٹھاتے ہوئے آنکھیں نچائیں۔

پر جب بڑا سا پختہ میدان کراس کرنے کے بعد وہ اگلے ڈھلانی راستے پر اُترنے

لگا تو بے اختیار میں رُک گئی۔

''گاڑی کدھر ہے؟'' میں نے ہوا میں ہاتھ لہرائے۔

وہ ہونقوں کی طرح میری صورت دیکھتا تھا اور میں اپنے آپ سے کہتی تھی۔

''میرے ملک کی پولیس کبھی ایسی بے مروّتی کا اظہار نہ کرتی۔''

میں نے اپنے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ اپنے پاؤں کو چھوا اور اشاروں سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ان میں درد ہے اور چلنا دُشوار ہے۔

اُس نے اشاروں کی اس زبان کو سمجھا اور اچھے بیٹے کی طرح مجھے بازو سے تھام کر چلانا چاہا۔

مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

''چلو میاں چلو'' میں نے خود کو تھپکی دی بلا وجہ ہی گاڑی کی آس میں پاؤں بھاری کر لیے تھے۔ بھگاؤ دردوں وردوں کو اور رِندوں کی طرح قدم اُٹھاؤ۔

استنبول کے سلطان احمت ایریا کی گلیاں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بازار تھے۔ پھر وہ ایک جگہ آ کر رُک گیا۔ میں خوابیدہ سی گلیوں کو دیکھتی تھی۔ بازار ابھی انگڑائیاں لے رہے تھے۔

گرینڈ بازار۔ اُس نے سامنے بازار کی طرف اشارہ کیا۔

بازار چہرے مہرے سے تو ویسا ہی تھا۔ پر میں نے بھونچکی سی ہو کر اپنے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ نہ وہاں کوئی منی چینج آفس، نہ دوسری سمت خوبصورت مسجد جس میں ہم نے عصر کی نماز پڑھی تھی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اشاروں سے منی چینج آفس کی بائیں رُخ پر جائے وقوع کی وضاحت کی اور نور عثمانیہ مسجد دائیں ہاتھ۔ خوب اشارے بھی دیئے اور زبان بھی چلائی۔

چلو خیر کسی نے رہنمائی کی اور پھر چل پڑے۔

ہو بہو گرینڈ بازار جیسے ایک اور بڑی سی سرنگ نما دروازے کے نمودار ہونے پر بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ پر اب اُس سُن وٹے کی بجائے میں خود بھاگی۔ نورعثمانیہ جامع (مسجد) چلاّ چلاّ کر کہا۔ پھر کسی نے اُسے سمجھایا۔

ٹانگیں پھر چلیں۔ اب جس بازار میں داخلہ ہوا تھوڑا سا ہی چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ ہم صحیح راستے پر ہیں۔ اور جائے وقوعہ بس آنے ہی والی ہے۔

میرا قیافہ درست تھا۔ جونہی بازار کا اختتام ہوا۔ نورعثمانیہ مسجد اور منی چینج آفس دونوں نظر آ گئے تھے۔ میں نے فوراً اُسے بازو سے تھاما۔ اندر لے گئی اور لڑکے کی سمت اشارہ کر دیا اور خود کونے میں بنے چھوٹے سے زینے کے دوسرے پوڈے پر کھڑی ہو کر کاروائی کے جائزے میں مصروف ہوگئی۔

ایک عجیب سی بات مجھے محسوس ہوئی۔ لڑکے نے صرف ایک چھلتی نگاہ سے مجھے دیکھا اور چہرہ جُھکا لیا۔

اور جب پولیس مین اُس سے بات کرنے لگا تو وہیں کونے سے ایک اونچا لمبا خوش شکل تیس کے ہیر پھیر میں نوجوان کھڑا ہو کر اُس سے اُلجھنے لگا۔ یقیناً وہ آفس کا انچارج ہوگا۔ اونچائی پر کھڑے ہونے سے ایک اور بات میرے مشاہدے میں آئی۔ اس کی گردن میں صلیبی کراس والی چین تھی۔ مجھے تھوڑا سا ذہنی جھٹکا لگا۔ یہ عیسائی ہے اور دوسرا لڑکا بھی یقیناً یا عیسائی ہوگا یا یہودی۔

استنبول میں یونانی عیسائیوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ سپین پر کیتھولک عیسائی غلبے کے بعد جب یہودیوں اور مسلمانوں کو دیس نکالا دیا گیا تو عثمانی ترکوں نے کُھلے دل سے یہودیوں پر اپنی مملکت کے دروازے وا کیے۔ تب سے آج تک وہ

یہیں آباد ہیں ۔

ذاتی طور پر میں بنی نوع انسان کے بشری تقاضوں، اُس کی فطری کمزوریوں اور بلند ظرفیوں کو مذہبی، لسانی اور تہذیبی خانوں میں بٹے ہوئے نہیں دیکھتی ہوں۔ ہر قوم، ہر مذہب ہر فرقے اور ہر گروہ میں اچھے بُرے عناصر ازل سے موجود ہیں اور ابد تک رہیں گے کہ کائنات ہستی کا توازن اسی اصول میں مُضمر ہے ۔دھو کہ دہی کے اس کیس میں انہیں اس حوالے سے دیکھنا مناسب ہی نہیں تھا پر جو بات مجھے اُس لمحے کلِک ہوئی تھی وہ لڑکے کے وہ الفاظ تھے جب میں نے اُسے اپنے پاکستان سے تعلق کا حوالہ دیا تھا۔ اسکی طنزیہ ہنسی بھی مجھے یاد آئی تھی ۔

''تو کیا ان کے ذہن اُس عالمی پروپیگنڈے سے متاثر ہیں جو اسلامی، عیسائی اور یہودی دنیا میں اس وقت جاری ہے؟''

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

تھوڑی سی گرما گرمی اور تُو تُو میں میں کے بعد پولیس مین مجھے باہر لے آیا۔ گرینڈ بازار کے باہر ڈیوٹی دیتے وردی والے سپاہی اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہیں وہ مختصراً کچھ بتا کر سامنے والی دوکان سے مترجم لے کر آیا جس نے مجھے بتایا کہ وہ یکسر انکاری ہیں ۔

اپنے دفاع میں میں نے دلیل دی کہ میں تین ستمبر کو استنبول میں داخل ہوئی ہوں ۔میرے پاس یہ متروک شدہ اتنا بڑا نوٹ کہاں سے آسکتا ہے؟''

یہ بات پولیس مین کو سمجھائی گئی۔ وہ پھر اندر گیا۔ میں بھی ساتھ تھی۔ اب پھر زوردار گفتگو شروع ہوگئی ۔مزے کی بات کہ لڑکے نے اس بار بھی مجھ سے آنکھ نہیں ملائی۔ چپ چاپ کھڑا سب دیکھتا تھا۔ پولیس مین بے چارہ بھیگی بلی اور اُسکا باس بُل ٹیریئر۔

پھر ہم دونوں باہر آ گئے ۔مترجم آیا جس نے مجھے کہا کہ میں پولیس اسٹیشن جا کر

تحریری درخواست دوں تا کہ اس پر ایکشن ہو۔

اتنی مشقت بھری خجل خواری کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ ہونٹوں اور آنکھوں میں بکھری اس ہنسی میں میں نے بہت دور تک گرینڈ بازار کے نقش ونگار کی شوخیاں دیکھیں اور پھر دونوں ہاتھ مترجم کے سامنے جوڑتے ہوئے گویا ہوئی۔

''جناب میں کیس کو ڈراپ کرتی ہوں۔ استنبول پولیس کی شاندار کارکردگی کو سیلوٹ مارتی ہوں۔ جو کچھ جاننے کی خواہش مند تھی وہ جان گئی ہوں اور مزید جان کاری کی ہرگز متمنی نہیں۔ ہماری پنجابی زبان کی ایک کہاوت ہے کہ پنڈ کا پتہ روڑیوں سے لگ جاتا ہے۔''

میں نے پولیس مین کے سینے پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا اور کہا۔

''جاؤ بیٹا۔''

اور جب مجمع بکھر گیا پھر پتہ نہیں مجھے کیا ہوا اور میں کیوں منی چینج آفس میں چلی گئی۔ اُسی جگہ جا کر کھڑی ہوئی۔ اس بار دونوں نے مجھے دیکھا پر میں صرف لڑکے سے مخاطب ہوئی۔

''تم تو بالکل مجھے اپنے بیٹے جیسے لگے تھے۔ پیارے سے، چمکتی آنکھوں والے۔ عورتیں جو مائیں ہوتی ہیں انہیں تو دنیا بھر کے بچے اپنے بچوں جیسے ہی لگتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہیرا پھیری نہیں کرتے اور جو کرنے کو دل مچلے تو پھر تمہارے آفس کے باہر کھڑے یہ بانکی سجیلی لڑکیوں کے پُرے کیا کم ہیں اس کام کے لیے۔

اپنی کسی بھی بات کا ردِّ عمل دیکھنے کے لیے میں رُکی نہیں تیزی سے باہر آ گئی۔ سُورج کی آب و تاب ابھی اپنے جوبن پر نہیں آئی تھی۔ بازار کی رونقیں ابھی پہلو بدل بدل کر بیدار ہو رہی تھیں۔ ملحقہ سڑک پر چلتی میں گرینڈ بازار کے دوسرے دروازے کی پہلی

کاری کے سامنے نفیس اور شاندار سے ریسٹورنٹ کے سامنے دھری کُرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر پُرتگال (مالٹوں) کا جوس گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اپنے آپ سے کہتی تھی۔

چلو اچھی ایکٹویٹی رہی۔ 5200 پاکستانی روپوں میں پڑنے والی یہ کہانی کچھ ایسی بُری بھی نہیں۔

پھر دفعتاً ایک خیال آیا۔ میری آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہونٹ مسکرانے لگے۔

باب نمبر:۷ تھوڑی سی آوارہ گردی اور تھوڑی سی دل پشوری

۱۔ نور عثمانیہ مسجد کے ساتھ بازاروں کے لمبے سلسلوں میں بکھری عظمت رفتہ کی جھلک دامن دل کو کھینچتی ہے۔

۲۔ بیازت سکوائر میں استنبول یونیورسٹی کو دیر تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کا بھی اپنا مزہ تھا۔

۳۔ سلطان عبدالحمید ثانی کے مزار پر خراج تحسین پیش کرنے کیلئے میرے ہونٹوں نے بے اختیار کہا تھا۔تم شریف مکہ نہیں بنے۔

یہ بڑا سنہری موقع تھا مجھ جیسی آپ پُھدری عورت کیلئے۔ میں سیما کے تسلّط سے آزاد تھی اور خود کو بے حد ہلکی پھلکی سی محسوس کر رہی تھی۔جی چاہ رہا تھا وہ گیت گاؤں۔

پنچھی بنوں،اڑتی پھروں نیل گگن میں

آج میں آزاد ہوں دُنیا کے چمن میں

دراصل اسمیں سیما بیچاری کا بھی کچھ قصور نہ تھا۔اٹھارہ اُنیس سال کی لڑکی بتیس سالہ ڈبل ایم اے پاس نوجوان کے لڑ لگی تو اُسکی چھتر چھاؤں میں اُنگلی پکڑ کر چلنے کی عادی ہوگئی۔میرے جیسی آوا گون ان پڑھ والدین کی ریت،روایت اور رواج سے بہت نہیں تو کسی حد تک باغی لڑکی جس نے اُن حفاظتی بیساکھیوں کو جو والدین اپنے بچوں کے گرد گھمانے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں ہائی سکول پہنچنے کے ساتھ ہی ٹوٹے ٹوٹے کر کے رکھ دیا تھا۔

خود انحصاری کی یہ عادت اس درجہ مزاج کا حصّہ بن گئی تھی کہ تیس سال کی عمر میں جا کر اٹھائیس سال کے جس لڑکے سے بیاہ ہوا وہ بڑا خوش شکل اور پڑھا لکھا افسر تھا۔پورے

خاندان نے کہا۔

''لو یہ کالی مراشن تو بڑی بخت والی نکلی ۔پر ہے بڑی منہ پھٹ ۔وسیہ تو مشکل دِکھتا ہے۔''

یہ تو بڑا کھلا چیلنج تھا۔کچھ کوشش میری، کچھ اس کی اور کچھ اللہ میاں کی کہ بس بات بن گئی اور اب تک بنی ہوئی ہے۔

نورِعثمانیہ مسجد کے سامنے اک ذرا رُک کر میں نے اُس کے منفرد یورپی باروق Baroque اور کلاسیکل عثمانی سٹائل کی تعریف کی ۔یہ اُن سات پہاڑیوں جن پر استنبول تعمیرا ہوا اور پھیلا میں سے ایک پر قائم ہے۔اس کے گردونواح میں بازاروں اورگلیوں کے پھیلے ہوئے تانوں بانوں میں مجھے کِس سمت جانا ہے۔میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

بے اختیار ہی نظریں نیلے آسمان کی طرف اٹھیں پھر محبت پاش نظروں نے اپنے اردگرد کو دیکھتے ہوئے خود سے کہا۔کسی بھی طرف، کسی بھی سمت، بس تھوڑی دیر کیلئے زمانے پہلے کے اِن بازاروں،ان گلیوں کے کِسی گھر کے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھوں۔کسی تھڑے پر چند لمحوں کیلئے بیٹھ کر سولہویں اور سترھویں صدی کی اُس خوشبو کو سونگھوں جو کبھی کارسی آنے والی شہزادیوں کے اجسام سے اٹھ کر اِن راستوں پر بکھرا کرتی تھی۔

مسجد کے ساتھ ساتھ بازاروں کے سلسلے ہیں۔لمبی، بل کھاتی مڑتی ۔ایک سے دوسری میں ضم ہوتی گلیاں اور بازار جو کبھی ڈھلان میں اُترنے اور کبھی چڑھائی میں چڑھنے لگتے ۔ان بازاروں میں اگر عظمت رفتہ کی جھلک دامن دل کو کھینچتی تھی تو وہیں ان کو ممکنہ حد تک جدید رنگوں میں رنگنے کا اثر بھی نظر آتا تھا۔پتھر کی اینٹوں سے بنے کشادہ چوک جہاں

چناراورمیپل کے بوڑھے درختوں کی چھاؤں، سرسبز گھاس، پھولوں، صنوبر کی چھوٹی قامت والے بوٹوں سے سجے آہنی جنگلوں کی باڑھوں سے گھرے لان جنکے سامنے پتھر کی اینٹوں سے بنے کشادہ میدان جن کے کناروں پر کافی، ڈرنکس، برگروں کے دیدہ زیب کھوکھے۔ میرے لیے یہ منظر پرانی اطالوی فلموں جیسے تھے جنہیں میں مسرورنظروں سے دیکھتی تھی۔

دومنزلہ، کہیں کہیں سہ منزلہ مکانوں کے نیچے بنے بازاروں میں دنیا بھر کی رنگا رنگ قوموں کا ایک ہجوم گردش میں تھا۔ بازار کیا تھے جیسے رنگوں کی قوس قزح فضا میں بکھری ہو۔ دوکانوں پر تنے سائبان شوخ سُرخ رنگوں میں کثرت سے تھے۔ ہاں البتہ نیلے پیلے بھی نظر آتے تھے۔

بیازت مسجد کے سامنے رُک کر میں نے قدیم تہذیبی ورثے اور کلچر کے اس گڑھ کومحبت وشوق سے دیکھا تھا۔ 1936 کی تعمیر جس پر بیازت کیمی قران کرسی لکھا ہوا تھا۔

مسجد کے سامنے میدان میں پتھر کی بڑی سلوں والے فرش پر کبوتروں کی ڈاریں بیٹھی دانہ دُنکا چگنے میں مصروف تھیں۔ عورتیں اور بچے دانہ ڈال رہے تھے۔ غڑغوں غڑغوں کی آوازیں، انکے پروں کی پھڑ پھڑاہٹیں فضا میں ایک نغمہ بار موسیقی پیدا کرتی تھیں۔ جو سماعتوں کو بھی بھلی لگ رہی تھی۔ مائیں اپنے بچوں کی کبوتروں کے ساتھ تصویریں بناتی تھیں۔ معصوم چہروں پر مسرت وشادمانی کے جو رنگ بکھرے ہوئے تھے اُن کا بھی دیکھنے سے تعلق تھا۔

یہاں ایک جانب چنار کا صدیوں پرانا درخت اپنے پر پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں کافی اور قہوہ خانے تھے۔ ایک پُر رونق سماں تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پیاس سے ہونٹ خشک ہورہے تھے۔ لسی کا پیکٹ لیا۔ مکئی کے دانے آراستہ پیراستہ

چوبی ریڑھیوں پر بک رہے تھے۔بوٹ پالش کرنے والے دولڑکے اپنا پٹارہ کھولے جوتے پالش کرنے میں مگن تھے۔بچے شور مچا رہے تھے۔میں نے لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اُن نوجوان جوڑوں کو شوق و رغبت سے دیکھا جو ایک دوسرے میں گھسے جانے کیا کیا قصے کہانیاں سُن اور سُنا رہے تھے۔

استنبول یونیورسٹی،بیازت سکوائر میں ہی ہے۔

میرے سامنے قدامتوں کا رنگ لیے استنبول یونیورسٹی کے داخلی دروازے کی ڈیوڑھی تھی۔کُرسی اونچی تھی اور آرام دہ سیڑھیاں چڑھائی کیلئے موجود تھیں۔لڑکیاں اور لڑکے بالے اُن پر ڈیرہ ڈالے بیٹھے تھے۔عشق ومحبت کے مظاہرے سرعام تھے۔سگریٹ نوشی بھی زوروں پر تھی۔جی تو چاہا تھا کہ کہوں۔

''اے میرے پیارے ترک بچو کیوں جان کے بیری بنتے ہو۔یہ نامراد بڑی بد بخت شے ہے۔پھر اپنی استانی پنے کو لگام ڈالی لعن طعن کرتے ہوئے کہ یہ سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہی کیوں ہے؟ کسی دن اس کے ہاتھوں بے عزتی نہ کروالینا۔''

آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں ترکی کا سُرخ جھنڈا لہراتا تھا۔میرے لبوں پر اسکی مزید ترقی اور خوشحالی کیلئے دعا تھی میں نے تھوڑا سا ستالیا تھا۔حُسن وعشق کے نظاروں سے کچھ آنکھیں سینک لی تھیں۔کام و دہن کی تھوڑی سی تواضع بھی ہوگئی تھی۔ذرا سی تازگی نے اٹھنے کیلئے کہہ دیا تھا۔

مگر ہوا یوں کہ اٹھتے اٹھتے رہ گئی تھی کہ ایک نوجوان جوڑا آکر میرے قریب دھری کُرسیوں پر بیٹھ گیا۔چہرے مہرے سے بڑے سُلجھے متین سے نظر آتے تھے۔شاید یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔میں نے سوچا۔واقعی میرا قیافہ درست تھا۔دونوں اُستاد تھے۔ایک ریاضی اور دوسرا معاشیات کا۔تعارف سے مجھے اُنکے میٹھے سے جذبات کا اندازہ ہوا

تھا۔انگریزی میں بھی ٹھیک تھے۔شاید اسی لیے میری کچھ جاننے کچھ باتیں کرنے کی خواہش سب پر غالب آ گئی تھی۔بات چیت سے اُنکے خیالات سے بھی آگاہی ہوئی۔ایسے ہی باتوں باتوں میں تُرکی کے یورپی یونین میں شامل ہونے کا مسئلہ زیرِ بحث آ گیا۔خاتون نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

''یورپی یونین میں صرف برطانیہ حکومتی سطح پر محض امریکہ کی خوشنودی کیلئے ترکی کے حق میں آواز اٹھاتا ہے مگر عوام اس کی بھی 40% مخالف ہے۔آسٹریا، یونان، ہنگری اور مشرقی یورپ تو زمانے گزر جانے پر بھی عثمانیوں کے ہاتھوں اپنی شکست کو نہیں بھلا سکے۔ان کے زخم شاید ابھی بھی تازے ہیں۔رہے جرمنی اور فرانس بھی مخالفت میں سرفہرست ہیں۔خائف ہیں اس کی آبادی کے تناسب اور اسلامی تشخص سے جسے ترکی کی طاقتور فوج بھی ختم نہ کر سکی۔ابھی اسی ضمن میں یورپی یونین کے ملکوں کا ایک سروے مخالفت اور حمایت میں سامنے آیا ہے۔مجموعی طور پر 65% آبادی مخالفت اور 35% حمایت میں سامنے آئی ہے۔

بڑی کھل کر باتیں ہوئیں۔

''کیا ترکی کے لوگ یورپی یونین کے اِن معاندانہ رویوں سے آگاہی رکھتے ہیں۔''میں نے پوچھا۔

''بالکل جانتے ہیں۔''

''دراصل اِن سب ملکوں کی آبادی مسلسل کم ہو رہی ہے۔ترکی تو اپنی آبادی کے بل بوتے پر یورپی یونین کی پارلیمنٹ میں اکثریت کے ووٹ حاصل کر سکتا ہے۔تجارتی کوٹے میں اُسکا حصہ زیادہ ہو گا جو انہیں دینا پڑے گا۔اسلام کے حوالے سے بھی خدشات علیحدہ ہیں۔

بڑی دلچسپ نشست رہی۔انہیں کہیں جانا تھا۔کھڑے ہوئے تو میں بھی خدا حافظ کہتے ہوئے چل پڑی۔

بہت اندر کی جانب کہیں بڑے بڑے چوبی اور آہنی دوپٹوں والے دروازے، کِسی میں موٹی سروں والی میخیں جڑی۔کہیں دو منزلہ اور کہیں سہ منزلہ عمارتیں۔چوبی بالکونیاں، آہنی شیشوں والی کھڑکیاں، کہیں خستگی اور کہنگی کا رنگ دور سے لشکارے مارتا۔

ہاں ایک بات بڑی واضح تھی۔یہ پیچ در پیچ سلسلے میرے پرانے لاہور جیسے تو تھے کہ وہاں بھی اندرون گلیوں میں بڑے بڑے تہہ خانے سٹوروں کا کام دیتے ہیں مگر ان کی تو شان نرالی تھی۔انہیں دیکھ کر ایک قوم کی ترقی کا احساس ملتا تھا۔دروازوں کے کھلے پٹ دیکھ کر دو گھروں میں داخل ہوئی یہ بڑے بڑے سٹور تھے۔تاجروں نے کرایہ پر یا خرید کر انہیں گوداموں کی صورت دے دی تھی۔کہیں کام بھی ہو رہا تھا۔اِن گلیوں میں مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ گورے بھی بے شمار تھے۔ایک بڑے سے گھر کے صحن میں کھڑے میں نے انہیں تصویریں بناتے دیکھا تو اندر چلی گئی۔کمبخت مارے فرانس سے تھے اور انگریزی کا ایک لفظ نہیں بولے۔وہاں ایک مقامی نے ہی بتایا تھا کہ یہاں مصنوعی جیولری کی ورکشاپ ہے۔

ماضی میں عثمانی سلاطین کے وقتوں میں یہ شاید سرائیں ہوں، ملازموں کے رہائشی گھر ہوں یا یہاں گرجے اور اصطبل ہوں۔یقیناً کچھ نہ کچھ اہم ہی ہوگا۔

اور انہی میں گھومتے پھرتے، آگے بڑھتے، چلتے دائیں بائیں مڑتے ایک سے بڑھ کر ایک نظّارہ سامنے آتا تھا۔ہینڈ بیگوں کی دوکانیں جیسے رنگوں میں گُتھی پڑی تھیں۔قالین آنکھیں پھاڑتے تھے۔میں نے دو ایسی جگہیں دیکھیں کہ مجھے لگا جیسے انہیں دیکھنا بھی میرے لیے ایک نادر تحفے کے برابر تھا۔ایک تو ہمارے صرافے بازار جیسا بازار تھا۔اُف زیورات کی چکا چوند روشنیوں کے بکھرے طوفان میں لشکارے۔آنکھیں خیرہ ہوئی

جاتی تھیں۔

دوسرا کسیرا بازار تھا۔رنگ محل کے کسیرے بازار جیسا مگر قدامت اور جدت کا دلکش عکاس۔وہ مانوس آوازیں ٹھک ٹھک ٹن ٹن جن سے سارا بچپن مانوس۔تانبے کے چمکتے رنگ، آرائشی پلیٹیں جن میں مختلف رنگوں کی نقاشی اپنے منہ سے بول رہی تھی۔اُن پر کندہ قرآنی آیات اللہ اور محمدؐ کے نام سجے تھے۔بڑے بڑے تھال،سماوار نظریں ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔فنکار لوگوں کے فن کا نگار خانہ۔

یونہی چلی جاتی تھی کبھی کسی طرف نکل جاتی،کبھی کسی طرف۔علی پاشا بازار سے آگے ایک موڑ پر قبرستان نظر آیا۔استنبول کے قبرستان بہت خوبصورت اور شاندار ہوتے ہیں۔چناروں،صنوبر اور دیوداروں کے درختوں اور پھول بوٹوں سے سجے۔یہ تو کچھ زیادہ ہی خوبصورت تھا شاید شاہی ہونے کی وجہ تھی۔

یقیناً یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ایک عمر رسیدہ شخص جو فاتحہ پڑھ کر باہر آرہا تھا جس سے میں نے پوچھا اور اُس نے اشاروں اور زبان سے بہت کچھ بتانا چاہا تاہم میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ سلطان عبدالحمید ثانی یہاں دفن ہیں۔میں والہانہ انداز میں جھپٹی تھی۔

ترکی کی تاریخ میں وہ ایک ناکام خلیفہ تھا۔اُس نے دُستوری حکومت بنانے کا وعدہ کیا۔مگر اُس نے خود کو مستحکم کرنے کے بعد دستور معطل کر دیا۔پارلیمنٹ برطرف کر دی تھی۔اُس نے تعلیمی اصلاحات پر توجہ نہیں کی تھی۔اُس کے دور میں ترکی کو زار روس نے بیمار مرد کہا تھا۔اِن سب کے باوجود اُس نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا تھا جو آج بھی اُسکی ذات کو جگمگاتا ہے۔اُس نے تھیوڈور ہرزل بابائے صیہونیت کے ہاتھ فلسطین کی زمین بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔

''وہ مسلمانوں کی ملکیت ہے۔میں اِسے بیچنے کا مجاز ہی نہیں۔''

ہر بار کی بھاری پیشکش کے باوجود وہ ٹس سے مس نہیں ہوا وہ شریف مکہ نہیں بنا۔
فاتحہ پڑھی تو آنکھیں جل تھل ہوگئیں۔
یہاں وہ شاہانہ کرّ وفر نہیں تھا۔بہت سادگی تھی۔سلطان عبدالعزیز بھی یہیں دفن
ہیں۔

میرا جی چاہتا تھا میں سارا دن اِن گلیوں میں چلتی رہوں۔جگہ جگہ بنے ڈھابوں اور قہوہ خانوں سے کھاتی پیتی رہوں۔تھک جاؤں۔کہیں بیٹھ جاؤں۔لوگوں کو دیکھوں۔اٹھوں پھر چل پڑوں۔مگر ایسا کرنا بہت مشکل تھا۔دن تو میں نے کم وبیش آدھے سے زیادہ اپنے منہ زور جذبوں کی نذر کرہی دیا تھا۔اب سیما کا مجھے ڈر تھا۔واپسی کا کوئی مسئلہ نہ ہوا۔میں نے گل ہانہ کہا۔کارڈ دکھایا۔میٹرو اسٹیشن کی رہنمائی لی اور جب میں کمرے میں داخل ہوئی۔سیما کی گونج دار آواز نے میرا استقبال کیا۔

''ساری دیہاڑی گل کردی ناتم نے۔رات کہا بھی تھا کہ کولی مارو جو ہوا سو ہوا۔تو مل گئے پیسے تمہیں۔''

میں نے اپنی خجل خواری اور مظلومیت کی وہ داستان سنائی کہ سیما کو چپ چپ کرتے ہی بنی۔

اف میرے خدایا اگر میں اُسے کہیں صرافہ بازار کا بتا دیتی تو اُس نے فی الفور جوتے پہن کر اٹھتے ہوئے کہنا تھا۔

''چل ابھی چل۔ہائے نوشی کیلئے کچھ خریدلوں گی۔کوئی چھوٹی موٹی سی چیز آشی کیلئے لے لوں گی۔ثمینہ کیلئے بھی کچھ لینا ہے۔اکلوتی بہو ہے میری۔''

اف دوکان در دکان پھرنا چیزوں کو خریداری کے نقطہ نظر سے دیکھنا اور بھاؤ تاؤ میں اُلجھنا کتنا جان جوکھوں والا کام تھا۔میری تو جان جاتی ہے ایسے کتوں کاموں

ہے ۔میں تو ماں اور ساس کے روپ میں پڑ کر بھی داج اور بریوں کے چکر میں نہیں پڑی ۔دونوں بہوؤں کو 2006 اور 2007 میں دو دو لاکھ روپیہ دے کر کہہ دیا تھا ۔بس یہی کچھ دینا ہے میں نے ۔زیور بنوا لو، کپڑے خریدلو، جوتے لے لو، بینک میں جمع کرا لو میری بلا سے ۔

کیسی مزے کی ساس اور ماں ہوں نا میں بھی ۔ہے نا اپنے منہ میاں مٹھو والی بات ۔پنجابی میں اسے کہتے ہیں ۔آپے میں رَجّی پُجّی آپے میرے بچے جین ۔

باب نمبر:۸ نیلی مسجد اور آراستہ بازار

۱۔ نیلی مسجد استنبول کا لینڈ مارک، مسجدوں کی دنیا کا ایک منفرد اور انوکھا شاہکار۔

۲۔ پیچ در پیچ گلیوں، گلیاروں کے سلسلے آپ کو کسی طلسمی دنیا میں لے جاتے ہیں۔

۳۔ ترک کردوں سے کرد مسئلے، دہشت گرد تنظیم پی کے کے اور موجودہ صورت حال پر گفتگو۔

نیلی مسجد۔چند بار زیر لب اِس نام کو دہرایا۔جی نہیں چاہتا تھا اِس آرمینیائی، بلقانی، بازنطینی اور اسلامی فن تعمیر کی آمیزش سے بننے والے عظیم الشان ورثے کو اِس عام سے نام سے یاد کروں۔یہ سلطان احمد کی مسجد ہے۔یہ سلطان احمت سکوائر کا لینڈ مارک ہے۔استنبول مسجدوں کا گھر ہے۔باسفورس اور مرمرا کے سنگم کے پہاڑ پر یہ اپنی مثال آپ، سب سے منفرد اور عظمتوں کی امین ہے۔

ہم باہر کھڑی تھیں۔گم سُم مبہوت شام کی سنہری کرنوں، فواروں کی ہیروں جیسی بل کھاتی لڑیوں اور اس کے نوکیلے میناروں میں گھری اس کی عظیم الشان عمارت کے گنبدوں کو دیکھتی اور انہیں سراہتی۔

کیسی دلچسپ بات کہ اس کے چھ میناروں نے اِسے مسجدوں کی دنیا میں منفرد مقام عطا کر دیا ہے۔یہ غلطی سے ہوا۔غلط فہمی ہوئی۔جو بھی ہوا بہت خوبصورت اور انفرادیت والا ہے۔سلطان احمد نے اس کے معمار محمد آغا سے سونے کا مینار بنانے کا کہا تھا۔ترکی زبان میں لفظ سونا ڈائک Dike ہے جو چھ کے معنی دیتا ہے۔محمد آغا نے چھ مینار بنا دیئے تو علما کے اعتراضات شروع ہو گئے کہ مسجد الحرام کے چھ مینار ہیں اور دنیا کی کسی مسجد کو اس کی ہم

سری کا حق حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔

بات تو درست تھی۔ تو کیا کیا جائے؟ سلطان سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحوں بعد سر اٹھایا مُسکرایا۔ سلطان تھا نا۔ اللہ کے گھر کو ایک اضافی مینار دے دیا۔

ایک جانب کے فٹ پاتھ پر ایک بوڑھا آدمی تسبیحیں، نیلی مسجد کے ویو کارڈ اور سونیئرز بیچ رہا تھا۔ لوگوں کے جتھے تھے جو اندر آ جا رہے تھے۔ یہ بھی پرانے ہپو ڈروم Hippodrome میں ہی تعمیر ہوئی۔ ٹوپ کاپی محل میں سلطان کی رہائش تھی اور مسجد قریب ہونے کی ضرورت تھی۔ اِسے خوبصورتی اور کشادگی دینے کیلئے کچھ بازنطینی محل مینارے اور کچھ عثمانی امرا و وزرا کے چوبارے بھی دان ہوئے۔

کشادہ صحن میں کبوتروں کی ڈاروں کا اڑنا، نیچے اترنا اور دانہ دُنکا چگنے کا منظر بھی بڑا خوبصورت تھا۔ صحن کے اطراف میں کشادہ برآمدے ہیں۔ یہیں وضو کرنے کا حوض ہے۔

اندر داخلہ ہوا۔ اس کے حُسن و رعنائی کو الفاظ کا جامہ پہنانا زیادتی تھی۔ بیچارے ہاتھ باندھے ملتجی سے کھڑے تھے کہ بس معاف کر دیں۔ مرکزی گنبد اتنا بڑا کہ آنکھیں پھاڑتا، مبہوت کرتا، ہمراہ چاروں اور گنبد ہی گنبد اُن میں کی گئی نقاشی، براؤن اور ہلکے رنگوں کے دلکش امتزاج سے آنکھوں میں اُتر رہی تھی۔ یہ چار بڑے ستونوں پر کھڑی ہے۔ جن کا پتھر دیواروں کی ٹائلیں اور نقاشی سب میں نیلا رنگ نمایاں ہے۔ نیلی جالیوں کی فسوں خیزی اور تحیّر سب سے انوکھا اور نرالا تھا۔ مقناطیس کی طرح توجہ کھینچتا تھا اور آنکھوں کو ہلنے نہیں دیتا تھا۔ عورتوں کا الگ حصّہ ہے۔ ماڈرن عورتوں نے سر اور ٹانگوں کو ڈھانپا ہوا تھا۔ جبکہ ایک اکثریت حجاب والیوں کی بھی تھی۔

ایک تو مصیبت زبان کی تھی۔ اشاروں سے باتیں ہوتیں۔ کیا پلّے پڑتا۔ بس اتنا

جانا کہ کچھ اسکدار یعنی استنبول کے ایشائی حصے سے آئی تھیں ۔بہت مہذب اور باوقار سی عورتیں لگتی تھیں اور کچھ ازمیر سے اپنے رشتہ داروں سے ملنے آئی تھیں۔ پاکستان کا سن کر خوش ہوئیں ۔عصر کی نماز پڑھی۔

اس کے ساتھ ایک مدرسہ،لنگر خانہ،شفا خانہ اور بازار بھی بنائے گئے ۔ہم نے مدرسے اور شفاخانے کی طرف تو توجہ نہ کی ہاں مگر بازار کی طرف ضرور لپکے۔اصل میں سیما کی خوشنودی بھی مطلوب تھی کہ اس کا موڈ ابھی بھی پوری طرح درست نہ ہوا تھا۔پوچھنے پر پتہ چلا کہ آراستہ بازار قریب ہی ہے۔

پیچ در پیچ گلیوں کے سلسلوں میں چلنے کا ایک اپنا لطف تھا۔کہیں دائیں بائیں پرشکوہ عظمتوں کے رنگ چہروں پر سجائے تمکنت سے کھڑی عمارتیں،کہیں چھتے ہوئے اور کہیں کھلے درّے جیسے گلیارے۔اِدھر مڑو اُدھر مڑو۔

آراستہ بازار کس قدر شاندار تھا۔دو رویہ دکانیں ، یہ چھتا ہوانہیں تھا۔مگر اس کی دکانیں اتنی شاندار اور خوبصورت کہ بندہ دیکھتا جائے اور جی نہ بھرے۔ساز و سامان سے بھری رنگا رنگ سٹولوں اور کرسیوں پر بیٹھے دوکاندار اور کہیں ملازم لڑکے گاہکوں کو متوجہ کرتے ،انہیں آوازیں دیتے۔

ایسی ہی ڈیکوریشن کی ایک ڈکان میں مجھے آرٹ کے دو ایسے شاہکار نظر آئے جنہوں نے مجھے دیر تک ہلنے نہیں دیا۔یہ دو پینٹنگز تھیں۔ایک استنبول پر قبضے کے پانچ سو سال پورے ہونے کے جشن کی تھی۔لوگوں کے خوشی سے نہال چہرے اور قدیم لباس۔کہیں کوئی سلطان کا روپ دھارے،کہیں کوئی سلطان کی خاص فوج ینی چری کا یونیفارم پہنے،کوئی خواجہ سرا کے پہناوے میں،کوئی گل بانو ملکہ بنی ہوئی اور کوئی کنیز کھلکھلاتے چہرے اور دیدہ زیب لباس میں ملبوس۔ڈریس فینسی شو لگتا تھا۔سچی بات تھی مصور نے ایک

عہد کو قید کرلیا تھا۔

دوسری اناطولیہ کے کسی قدیمی بازار کی تھی۔ کھلے میدان میں کہیں کپڑوں کے سائبانوں کے نیچے اور کہیں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں چوغوں میں ملبوس اشیائے کو چک کے لوگ پھل، سبزیاں اور دیگر ضروریات زندگی کو ڈھیروں کی صورت بکھرائے اور کہیں سلیقے سے سجائے بیچنے میں مصروف ہیں۔ گدھے گھوڑے سب نظر آتے تھے۔ بھاؤ تاؤ کا منظر بھی تھا۔

لڑکے نے میری دلچسپی اور محویت بھانپ لی تھی۔ لسوڑے کی لیس کی طرح چپک گیا تھا۔ دل تو میرا بھی بے طرح دونوں تصویروں پر آیا ہوا تھا مگر لے جانا کوئی خالہ جی کا گھر تھا۔

میں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اُس کے لیکچر سے تصویروں کا پس منظر جانا اور باہر نکل آئی۔ سیما قالینوں کی دوکان میں تھی۔ وہ باہر نکلی تو ہم دونوں اکٹھی سونیئرز کی ایک دوکان میں جا گھسیں۔ یہاں ایک مزیدار تجربے سے ہم کنار ہوئے۔ جب ہم نظر بٹو اور دیگر اشیاء کا جائزہ لے رہے تھے۔ دوکاندار نے ٹیبل میٹس کا سیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لاجواب ساتحفہ میں اپنی پاکستانی ماں کو پیش کرتا ہوں۔''

سیما نے فوراً رُخ پھیرا اور بولی۔ ''عجیب احمق ہو۔ دوسری ماں کو بھول رہے ہو۔ اُسے کیا عنایت کرو گے۔''

''ارے''۔ نوجوان لڑکا کھلکھلا کر ہنسا۔

''آپ آنے (ماں) کب ہیں؟ آپ تو ڈارلنگ ہیں۔ ڈارلنگ، مائی ڈارلنگ۔

سیما تو لال بھبوکا ہوگئی۔ ہاتھ میں پکڑا نظر بٹو اُس نے پٹخ کر پھینکا اور

بے اختیار پہلے پنجابی پھر انگریزی میں برسی۔

اُلو کا پٹھا کیا بکواس کر رہا ہے؟

سیما کے اِس انداز پر افروختگمی پر وہ نہال ہوتے ہوئے بولا۔

''غصہ، غصہ نہیں۔ آج رات میرے ساتھ ڈنر کریں۔''

سیما میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً مجھے گھسیٹتی دکان سے باہر کھینچ لائی۔

''ذلیل وہ تمہیں کھانے کی دعوت دے رہا ہے اور تم کفران نعمت کر رہی ہو۔''

''بند کرو بکواس۔'' وہ چلائی۔

''بڑی مارکیٹ ویلیو ہے بھئی تمہاری۔ مجھے تو رشک آرہا ہے۔''

قریبی ریسٹورنٹ میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں ہنسے چلی جارہی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ میں گئی یقیناً کھانے کا کچھ آرڈر کرنے۔ جب اُبلے چاول، بینگن کی ڈش اور سلاد آیا۔ میں نے سلاد کی پلیٹ سے ٹماٹر کا قتلہ اٹھا کر منہ میں ڈالا اور کہا۔

''لے کھاڈپ یہ غریبڑا سا کھانا۔ تجھے بھی ڈنر قبول نہیں تھا۔''

بدمزہ سے اِس کھانے کا سیاپا ہی ختم ہونے میں نہ آرہا تھا۔ سیما نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ہنسی مذاق اور ٹھٹھول بازی میں ہی تھوڑی سی منہ ماری ہوئی۔ پھر سوچا کہ استقلال سٹریٹ کی سیر کی جائے۔ وہاں کی آئس کریم کی بڑی شہرت تھی۔ یا تقسیم میدان چلیں اور رات کا پہلا پہر وہاں گزاریں۔

ابھی ہم یہیں اِس پرانے روایتی کلاسیکل قسم کے منظروں والے ماحول کی کبھی دائیں ہاتھ اور کبھی بائیں ہاتھ کی گلیوں گلیاروں میں پھر رہی تھیں جب ہم نے ایک سٹائلش اور منفرد سی عمارت کو دیکھا۔ سلطان ریسٹورنٹ۔ اندر جا گھسے۔

بلّے بھئی بلّے۔ یہ تو رنگ و مستی اور موج میلے کی ایک اپنی ہی دنیا تھی۔ شیشہ کیفے

تھا کہ لیچیے تھے گھر تھا۔ وسیع وعریض کشادہ ہال نما کمرے کی آرائش وزیبائش پر آنکھیں جمی جاتی تھی۔ دیواریں آرٹ کے شاہکاروں سے سجی ہوئی تھیں۔ ایک جانب چھتوں کی ایسی رنگ رنگیلی ورائٹی تھی کہ لگتا تھا جیسے قوس قزح تو یہیں اُتر آئی ہے۔

واہ ری کاروباری دنیا تیرے صدقے کھیسہ خالی کرنے کے کیا کیا رنگ ڈھنگ نکالے ہیں تو نے۔ ہم متوسط پاکستانی عورتوں کو اپنے ہاں کی برکتے جھنتے ٹائپ مٹی کی چلمیں دیکھنے والوں کو یہاں کی وکھری ٹائپ چلموں میں مارلن منرو اور الزبتھ ٹیلر کے سٹائل اور رنگ روپ ہی دِکھے تھے۔ کیا بات تھی انکی نئریوں کی۔ ہر نئری اپنی ساخت اور حسن میں منفرد اور یکتا۔

کہیں چوبی ڈیزائن دار صوفوں، کہیں دیوان، کہیں میز کے گرد دھری کرسیوں، کہیں تپائیوں کے گرد بیٹھے نیم برہنہ حسین چہرے ہونٹوں سے دھواں نکالتے اپنے سامنے شطرنج کی بساط بچھائے چالیں چلنے میں مگن تھے۔ کہیں عشق و عاشقی کی سرمستیاں تھیں۔ مے نوشی بھی جاری تھی۔ بڑی کیف آور سی ڈوبتی اُبھرتی موسیقی کی دُھنیں سینوں میں تلاطم کی سی کیفیت پیدا کرتے ہوئے ماحول کی رنگینی کو کچھ اور بھی بڑھا رہی تھیں۔ کو فضا دُھواں دھواں سی تھی پر اِسمیں نشیلی سی مہک کا بھی رچاؤ تھا۔

سیما کو شاید گھٹن کا احساس ہوا تھا۔

''دفع ہو جاؤ نکلو باہر۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

''ہائے کیا دنیا ہے'' میں تو ابھی اِن نظاروں کے اور مزے لوٹنا چاہتی تھی۔

''لعنت نہیں بھیجتیں۔''

''ایسا تو نہ کہو سیما۔ جنت بھی تو ایسی ہی ہوگی۔ آخر آدم و حوا کی دل پشوری کا بھی تو کچھ سامان ہوگا وہاں۔''

سیما کوئی تند سا جواب دینے کی بجائے باہر کی طرف لپکی ۔میں نے بھی تعاقب میں قدم اٹھائے ۔باہر کی کھلی فضا میں شام کا حسن بکھرا ہوا تھا۔جسے اُس نے اپنی آنکھوں اور سانسوں میں کشید کرتے ہوئے میری توضیح "ملعون اور ملحد" کہتے ہوئے کی۔

میں سیما کی لعن طعن سے حظ اٹھا رہی تھی جب ہم نے سامنے سے آتے تین سوٹڈ بوٹڈ مردوں کو دیکھا۔ساتھ ساتھ چلنے والوں میں دو اپنی دراز قامتی اور رنگت کی سرخی و سفیدی میں بڑے نمایاں تھے ۔بقیہ ایک رنگت کے ساتھ ساتھ قد کاٹھ میں بھی ذرا ماٹھا سا تھا۔اسی ذرا پست قامت اور دبتی رنگت والے نے ہمیں توجہ سے دیکھا اور ہم سے چند قدم پر رُک کر پوچھا کہ کہ ہم کیا پاکستانی ہیں؟اردو میں یہ استفسار رُوح تک میں سرشاری سی دوڑا گیا۔

سچ تو یہ ہے کہ وطن سے محبت کے احساس کو وطن میں رہتے ہوئے محسوس ہی نہیں کیا جاسکتا۔جونہی کہیں آپ اس کی سرحدوں سے باہر نکلتے ہیں محبت دریا کے طغیانی زدہ پانیوں کا روپ دھار لیتی ہے کہ اپنی حدوں میں سماتی ہی نہیں۔اُچھلتے،کودتے اس کے کناروں سے باہر اُبل اُبل پڑتی ہے۔

پتہ چلا کہ صاحب عزیز الرحمٰن پکے لاہوری ہیں ۔یہاں حبیب بینک میں وی پی ہیں ۔ساتھی بھی بینکار تھے ۔ایک انقرہ سے اور ایک سرنک سے۔

انہوں نے رخصت ہونا چاہا مگر میں اُنہیں کیسے رُخصت ہونے دیتی؟میرے ہاتھ تو بٹیرے آگئے تھے ۔گھر کی تو صورت جو نظر آئی تھی اُسکی چاہت اپنی جگہ پر مجھے تو اب کچھ جاننے کے اُچھل پیڑے لگ گئے تھے کہ عزیز الرحمٰن کے تینوں ساتھی کُرد تھے۔

تعارف نے میرے دماغ میں برق کے کسی کوندے کی طرح ایک یاد کو روشن کردیا تھا۔بہت عرصہ پہلے ترکی کے کُردوں بارے پڑھا ہوا ایک ناول یاد آیا تھا۔اتنا

دلچسپ اور حیرت انگیز تھا کہ ابھی تک ٹوٹی پھوٹی کیفیت میں ذہن کے کسی کونے کھدرے میں اپنے انوکھے پن کی وجہ سے پڑا ہوا تھا۔ناول دہشت گردی کے حوالے سے تھا۔ہم جیسے لوگ جواب پورپور اِسکے ہاتھوں زخمی ہیں تب اس کے مفہوم سے بھی اتنے آشنا نہ تھے۔ استحصال شدہ طبقات کے جذبات واحساسات کی خوبصورت نمائندگی تھی۔امن اور محبت کے نظریئے کو اپنانے اور فروغ دینے کی ضرورت پر زور تھا۔کسقدر شوق وتجسس سے پڑھا تھا۔ہاں البتہ تفصیلات کچھ اتنی زیادہ ذہن میں نہ تھیں۔

اب جو اتفاق سے موقع نصیب ہوا تو سوچا ان کے بارے کچھ معلوم تو ہو۔اسی لیے میری خاموش ملتجی آنکھوں نے سیما کے حضور درخواست پیش کی کہ مجھے اُس کا تعاون چاہیے۔سیما بھی کسی حد تک حق بجانب تھی کہ عزیز الرحمٰن نے بتایا تھا کہ وہ اپنے مہمانوں کو شیشہ پلانے کیلئے لے جارہا ہے۔

میری درخواست پر کہ ہمیں تھوڑا سا وقت دیں۔اور یہ کہ شیشہ کیفے کی فضا بڑی مست ہلّے غلّے کی سی ہوگی جہاں کوئی سنجیدہ سوال نہیں ہو سکے گا۔اور خدا کا شکر انہوں نے میری درخواست کو پذیرائی دی۔قریبی قہوہ کیفے کے اوپن میں بیٹھنے کیلئے جب ہم چلنے لگے میں بے صبروں کی طرح جھپٹی اور مدعا بیان کردیا۔

''شاید کردستان لیبر پارٹی جسے PKK (ترکی کی دہشت گرد تنظیم) کہتے ہیں پر لکھا گیا ہو۔مصنف کا نام نہیں یاد؟''

سرنک سے تعلق رکھنے والے عثمان کوران نے میری بات سُنتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا۔

میرے لہجے میں تاسف سا گھل گیا تھا۔"ہائے وہی تو یادنہیں آرہا ہے۔"

دراصل یہ کردستان کا بھی بڑا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔چنار کے صدیوں پرانے درخت

کے نیچے بیٹھتے ہوئے عثمان کوران نے بات کا جونہی آغاز کیا۔ مجھے احساس ہوا کہ بس بڑی واجبی سی انگریزی ہے۔

پہلے تھوڑا سا پس منظر جان لیں۔ ترکی کی اقلیتوں کا یہ سب سے بڑا السانی گروپ ہے جو انڈو یورپین زبان بولتے ہیں۔ شام اور عراق کے شمالی حصّوں، ایران کے مغربی اور ترکی کے جنوب مشرقی حصّوں میں ان کی اکثریت ہے۔ ترکی کی آبادی کا 20% ہیں۔ کہہ لیجیے کوئی بارہ ملین کی آبادی ہے۔ شام، ایران اور عراق میں ملا جلا کر کوئی 25 ,20 ملین بنتی ہے۔

یہ بھی مقام شکر تھا کہ شربتی آنکھوں والے فاروق حلمی نے بولنا شروع کر دیا۔ اتنا خوبصورت، پُر مزاح اور رواں لہجہ سچ تو یہ تھا کہ مزہ آگیا۔

''ارے بھئی کہتے ہیں بڑی لائی لگ سی قوم ہے۔ اب میں اسے اپنی پنجابی میں کہوں تو یہی مفہوم ہوگا کہ جنہیں لایا گلیں تے اوہدے نال اٹھ چلی۔ کسی تھالی کا ڈھکن نہیں۔ کسی سینی کا پیندا نہیں۔ لڑھکتی پھرتی رہتی ہے۔ یار لوگ تو فصلی اور موسمی بیٹروں جیسی بھی کہتے ہیں۔

عزیز الرحمٰن نے مینو کارڈ ہمارے سامنے رکھتے ہوئے عثمان اور فاروق کی گفتگو کا سلسلہ توڑتے ہوئے کہا۔

''آپ کو جو پسند ہے اُسے بتائیں۔''عزیز الرحمٰن کوئی پینتیس چالیس کے پیٹے میں ہوگا بیٹوں جیسا۔ میں نے بے تکلفی سے کہا۔

''ہمیں تو کسی شے کی طلب نہیں ہمارے لیے سب سے اہم تو ان کی باتیں سُننا ہیں۔''

فاروق نے عزیز الرحمٰن سے قہوہ منگوانے کا کہتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔

''آپ نے شاید گردوں بابت بہت سی مشہور زمانہ عربی کہاوتیں پڑھی ہوں گی۔یوں گرد بھی بڑے تیز ہیں انہوں نے بھی عربوں اور ترکوں کیلئے بڑے لطیفے گھڑ رکھے ہیں۔کچھ سنانے والے ہیں اور کچھ نہیں۔

بڑا زوردار قہقہہ پڑا تھا۔گردوں پر ایک گرد کا سچا اور بے لاگ تبصرہ۔

مگر ہوا کیا اِس زندہ دلی کے مظاہرے کے ساتھ ہی جیسے عثمان حلمی کی آواز میں دُکھ سا گھل گیا تھا۔پر کیا کریں جی۔بیچارے زمانوں سے بڑی طاقتوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں صرف اس امید پر کہ شاید یہ انہیں آزاد گردستان کا شہری بنادیں۔مگر نہیں جی یہ طاقتیں بڑی ہی بدمعاش ہیں وہ کوئی کام اپنے مفاد کے بغیر نہیں کرتی ہیں۔انہوں نے جب بھی مشرق وسطیٰ کے کسی ملک کا ٹینٹوا دبانا چاہا ان احمقوں کو استعمال کیا۔

دراصل کسی بھی ملک میں لسانی یا مذہبی گروہوں میں حقوق کی پامالی نہ ہو۔سلطنتوں اور مملکتوں میں سیاسی اور سماجی سطح پر حصہ داری ملتی رہے۔ہونے کے احساس کی تسکین ہوتی رہے تو شاید مسائل جنم نہ لیں۔عثمانی دور میں بھی یہ لوگ نظر انداز ہوتے رہے۔گلے شکوے شکائتیں تو تقریباً زمانوں سے تھیں۔تاہم تحریک کا باقاعدہ آغاز ترکوں کی جنگ آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔

عثمان حلمی کی باتوں نے جیسے میری یاداشتوں کے کوڑے کباڑ سے بہت سی چیزوں کو نکال کر تازہ کر دیا تھا۔مجھے عبداللہ اوجلان کا نام یاد آیا تھا۔اسی کے بارے پوچھنے پر پتہ چلا تھا پیدائش ترکی کے ایک گاؤں جو شامی سرحد کے قریب ہے۔بچپن ہی سے خودسر اور باغی سا تھا۔بڑا کٹر کیمونسٹ لینن کا پرستار، شادی ناکام، بچہ بھی کوئی نہیں۔گردش ورکس پارٹی اُس نے لگ بھگ 1978 میں بنائی تھی۔ابتدا میں تو گرد کلچر محفوظ رکھنے، اور گردوں کیلئے آزاد گردستان کے حصول کا مقصد پیش نظر تھا۔آہستہ آہستہ قباحتیں بھی شامل ہوتی

گئیں۔

پارٹی کبھی یورپی یونین،کبھی امریکہ اور فرانس کے ہاتھوں کھلونا بنی رہی۔صدر متراں اور اسکی بیوی کے تو کچھ زیادہ ہی محبوب تھے۔دنیالہ متراں تو باقاعدہ کُھلے بندوں PKK کو مالی وسائل مہیا کرنے میں بڑی پیش پیش رہی۔کچھ ایسا ہی حال برطانیہ اور جرمنی کا تھا۔

اب بیچاروں کی بھی مجبوریاں،ملکوں میں بٹے،قوموں میں گھرے اپنی شناخت اور اپنی پہچان کی انفرادیت قائم رکھنے کیلئے مرتے کبھی ترکوں سے جوتے کھاتے اور انہیں کھلاتے،کبھی ایرانیوں سے بھڑے بازیاں کرتے،کبھی عراقیوں اور شامیوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتے،ان کی گولیوں سے بُھنتے اور زہریلی گیسوں سے مرتے۔

سچی بات یہ ہے کہ اُن کے مسائل کو ہمدردانہ نظر سے دیکھا ہی نہیں گیا۔ترک فوج کی بھی بڑی زیادتیاں تھیں۔

اصل سیاپا جنرل کنعان ایورن کے مارشل لانے ڈالا۔دہشت گردی کا پھیلاؤ ہی تب سے شروع ہوا۔ضرورت تھی کہ ان کے ساتھ مذاکرات کیے جاتے اور انہیں قومی دھارے میں شامل کیا جاتا۔ترگت اوزال کی کاوشیں شاید ثمر بار ہوجاتیں اگر ترک قوم پرست تھوڑی سی لچک کا مظاہرہ کرتے تو یقیناً صورت حال نے گرفت میں آجانا تھا۔یہ بھی ایک نمبر کے ذلیل ہیں اور یورپی یونین بھی ذلیل ترین۔

عبداللہ اوجلان کو امریکہ نے 15 فروری 1999 کو کینیا سے پکڑ کر ترکی کی حکومت کے حوالے کیا۔اُسے پھانسی پر چڑھا دینا چاہیے تھا۔مگر یہ بھی یورپی یونین کی بدمعاشی کہ پھانسی نہیں دینی جی۔اور پھر اس پھانسی والے ملکے کو بھی ہمیشہ کیلئے ختم بھی کروادیا۔

دہشت گردی تو جاری رہی۔لوگوں کے ساتھ کیا کیا ظلم ہوئے اس کی تفصیلات

قطعاً خوشگوار نہیں ۔بگلیو میں رہنے والے چند خاندانوں سے مل لیں اگر وقت ہو۔بہت دردناک کہانیاں سننے کو ملیں گی ۔

لوگ بہت مضطرب رہے ۔ملک کا جنوب مشرقی حصہ یقیناً بہت متاثر ہوا۔سیاسی طور پر بہت غلطیاں ہوئیں ۔بہر حال اب موجودہ حکومت اپنی کوششوں میں خاصی سنجیدہ نظر آتی ہے ۔انکی پارٹی میں کُرد ترک تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور پارلیمنٹ میں ان کی رکنیت بھی زیادہ ہے ۔کردوں کی نمائندہ جماعت HDP اب اِس ضمن میں خاصا کام کر رہی ہے ۔بہر حال دعا ہے کہ حالات بہتر ہوتے جائیں ۔

امین کہنے میں اگر ہماری آواز زوردار تھی تو اپنے ملک کیلئے بھی دل ہی دل میں دعا گو ہوئے ۔

ہم قہوہ نہیں پینا چاہتے تھے ۔گاڑھا کسیلا قہوہ ترکوں کی زندگی میں گھلا ہوا۔سنتے ہیں کہ دنیا میں قہوے کی دریافت بھی استنبول میں ہوئی ۔ترکوں کیلئے یہ ہاضم ہے ۔چُست رکھنے کا ایک موثر ذریعہ ہے ۔ہوگا ہم تو دوبار سے زیادہ اسے پی نہیں سکتے تھے کہ معدے کی جلن کا شکار ہونے لگتے ۔ہمارے لیئے تو آئرن (لسی) بہترین مشروب ہے ۔اب شرما شرمی چند گھونٹ بھرے ۔شکریہ ادا کیا ۔اجازت لی اور رخصت ہوئے ۔

باب نمبر:9 سلطان محمد فاتح

۱۔ سلطان محمد فاتح خدا کے منتخب لوگوں میں سے ایک تھا۔

۲۔ مسجد کے گردونواح کا علاقہ بڑا کلاسیکل قسم کے مناظر کا حامل تھا۔

۳۔ جانشینی سے متعلق سلطان محمد فاتح کا قانون میکیاولین جیسے ہتھکنڈوں کی بھونڈی شکل تھی یا کہیں سربراہ مملکت بارے حدیث سے متعلق اُسے کوئی ذہنی ابہام سا تھا۔

اُس جیالے سلطان محمد فاتح کا مقبرہ، اس کی یادگار "مسجد فاتح" دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ یوں مسجدیں تو کم وبیش تھوڑے بہت فرق سے ایک جیسی ہی تھیں۔ استنبول تو ویسے بھی مسجدوں کا گھر ہے۔ مگر بات اُس قلبی تعلق اور رابطے کی ہے جو آپ کو اُس ہستی سے کہیں گوندھ دیتی ہے۔ سیما بھی ایسی ہی خواہش کی اسیر تھی۔

بس تو نکل پڑیں۔ آقسرائے Aksaray سکوائر تک میٹرو کا سفر کیا۔ سڑک کے کنارے خوبصورت پر چھوٹی سی مسجد کو ہم نے توجہ سے دیکھا۔ نفل پڑھنے کی نیت سے اندر گئے تو معلوم ہوا ولادی valide مسجد ہے جو مادر ملکہ کے نام سے ہے۔ نفل پڑھے۔ دعائے خیر مانگی۔ یہ آقسرائے کا علاقہ تھا۔ اتنا خوبصورت جتنا جھوٹ بولا جائے۔ مصروف ترین ہوٹلوں، موٹلوں، بسوں، گاڑیوں، میٹرو اور رنگا رنگ لوگوں، پارکوں اور عمارتوں سے بھرا پڑا۔

اب جو چلنا شروع کیا تو بس چل سو چل والا معاملہ ہوا۔ جس نے جدھر چاہا اُدھر دھکیل دیا۔ منسٹری اف ملٹری آفیئرز کی عمارت نظر آئی۔ جس چیز نے توجہ کو فوراً کھینچا وہ چمکتے

سنہرے حروف کے ساتھ دائیں بائیں لکھی ہوئی قرآنی آیات تھیں۔ ''انا فتحنا لک فتحا مبینا'' ''و ینصرک نصراً الله عزیزاً ''اس کے مرکزی گیٹ پر استنبول یونیورسٹی لکھے دیکھا تو رک گئیں۔ لاطینی کے ساتھ ساتھ عربی میں بھی سال اور نام لکھے گئے تھے۔ اِس یونیورسٹی کی بنیاد سلطان محمد فاتح نے شہر فتح کرنے کے ساتھ ہی رکھ دی تھی۔

شکر ہے یہ برصغیر کے غزنویوں سے مختلف نکلا جو ہندوستان کو فتح کرنے نہیں لوٹنے آتے تھے۔ ابتدا میں نام کچھ اور تھا درمیانی وقفوں میں بھی نام بدلتے رہے مگر اب یہ استنبول یونیوسٹی ہے۔

گیٹ پر روک لیا گیا۔ تعارف کروایا۔ پاسپورٹ دکھائے۔ تب داخلہ ہوا۔ اندر داخل ہونے پر کیا خوبصورت نظارہ تھا۔ کشادہ راستے اور اطراف میں سبزے سے دمکتے باغات کا سلسلہ، چنار کے درخت، سدا بہار پستہ قامت دیوداروں کی قطاریں، پھولوں کے قطعے، فضا میں فطرت کا حسن اور رنگینی بکھری ہوئی تھی۔

متاثر کن عالیشان عمارتیں تھیں جن میں یقیناً مختلف ڈیپارٹمنٹ اور فیکلٹیز ہوں گی۔ اس وقت شام تھی اور یونیورسٹی تو تقریباً اف ہی تھی۔ گیٹ کیپر بڑے خوش مزاج تھے۔ مگر انگریزی سے نابلد تھے۔ مسکراہٹیں ضرور بکھریں۔ کچھ ہماری کچھ اُن کی۔ ہاں البتہ کتابوں نے ضرور بتایا تھا کہ یہاں فاتح سلطان محمد نے کچھ وقت اُس محل میں گزارا جو بازنطینی شاہوں کا تھا۔ اور اس سے بھی پہلے پانچویں چھٹی صدی میں یہاں روم کے سینٹ پیٹرز کی طرز کا چرچ تھا جس کی تعمیرات ہوئیں۔

ہاں البتہ جب جمہوریت کا آغاز ہوا۔ دارالخلافہ انقرہ چلا گیا تو بہت سی وزارتوں کے جانے سے اِسے یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا۔

گیٹ کے دربانوں نے رہنمائی ضرور کی مگر منزل تک پہنچنے میں ہم نے مزید کسی

سے پوچھنے کا تکلف نہیں کیا۔ دراصل پرانے استنبول کے گلی کوچوں میں پھرنا اور بھٹکنا بہت مزے کا کام تھا۔ کافی دیر تو ہم یونیورسٹی کی ڈیوڑھی سے باہر اُس پارک میں بیٹھے رہے جو سڑک تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں لوگوں کو دیکھنا بڑا دلچسپ شغل تھا۔ خوانچے والے سے سمط لیکر کھائے۔ قہوہ پیا۔ جوڑوں پر تبصرے کیے جو سگرٹوں کے دھوئیں اڑاتے عشق و محبت کی پینگوں میں جُھولے لے رہے تھے۔ چلنا شروع کیا تو کچھ ہی دیر بعد مسجد کے سامنے تھے اور خود سے کہتے تھے تو یہ ہے استنبول کی پہلی شاہی مسجد۔ سڑک پر ٹریفک سگنل کے سامنے اِسے بہت دیر دیکھتے رہے۔ دروازے پر کھڑے کھڑے یہی سوچتے رہے کہ اس نے کتنے رنگ و روپ بدلے ہیں۔ پہلے یہاں کیا کیا تھا؟ بازنطینی دور میں سینٹ آپاسٹولی چرچ Apostoli تھا۔ فتح کو دس سال گزر گئے تو سلطان محمد فاتح کو یہاں ایک ثقافتی کمپلیکس اور نماز کیلئے مسجد بنانے کا خیال آیا۔ جس کو وہ اپنا نام دینا چاہتا تھا۔ شاید کہیں اس دل میں بازنطینی دور کی عظیم الشان عمارتوں اور گرجا گھروں جیسی خوبصورت یادگاریں بنانے اور مقابلے کی ایک ترنگ بھی ہو۔ فاتح مسجد اور فاتح کمپلیکس جو پرائمری مدرسوں، لائبریریوں، شفاخانوں، خیراتی اداروں پر مشتمل تھا۔ فاتح کمپلیکس ایک طرح کی پہلی فاتح یونیورسٹی تھی۔

معماروں کے متعلق دو رائیں ہیں۔ ایک یونانی نثراد عاتک سنان اور دوسرا یونانی کرسٹوڈولس Christodoulos۔ پر تعمیر سے وابستہ جو کہانی ہے وہ کرسٹوڈولس کو نمایاں کرتی ہے۔ کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ ایک روایت تو یہ ہے کہ کرسٹوڈولس نے مسجد بناتے ہوئے یہ خیال رکھا کہ مسجد کے ستون ایا صوفیہ کے ستونوں سے ہرگز بلند نہ ہوں کہ ایسا کرنا اُس کی ایا صوفیہ سے محبت کا تقاضا تھا۔ مگر یہی بات سلطان کی ناراضگی کا باعث بن گئی اور اس نے معمار کے دونوں ہاتھ کٹوا دیئے۔

دوسری روایت کچھ یوں ہے کہ مسجد اور کمپلیکس اتنے خوبصورت تھے کہ سلطان نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دوسری مسجد اس کی برابری کرے۔ یوں اُسنے ہاتھ کٹوادیئے۔

تاہم معمار اس زیادتی پر خاموش نہ رہا اور کیس قاضی کے پاس لے گیا۔ بڑا سنگین معاملہ تھا۔ قاضی نے مدعی اور مدعی الیہ دونوں کو عدالت میں طلب کرلیا۔ دونوں حاضر ہوئے۔ سلطان ابھی بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا جب قاضی نے اُسے کھڑا رہنے کا حکم دیا۔ فوراً تعمیل کی گئی۔ مقدمے کی سماعت کے دوران اُسے بتایا گیا کہ اُس نے سنگین غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اُسے سخت ترین سزا سنائی گئی۔ سلطان نے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور کہا کہ وہ واقعی مجرم ہے اور ہر سزا بھگتنے کیلئے تیار ہے۔

عدالت برخاست ہونے پر قاضی سلطان کے قدموں میں گرا اور بولا کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا کہ یہ اس کے فرض کا تقاضا تھا۔ جب وہ جھکا ہوا تھا اس کی آستین سے ایک زہریلا سانپ پھسل کر فرش پر گر پڑا۔ سلطان نے حیرت سے پوچھا۔ یہ کیا؟ بتایا گیا سلطان معظم اگر آپ قانون کی اطاعت نہ کرتے تو اس سانپ سے آپ کو ڈسوا کر ہلاک کردینے کا پروگرام تھا۔ سلطان نے بھی اپنی پوشاک سے تلوار نکالی اور اُسے لہراتے ہوئے بولا۔

''اگر تم بھی مجھے بری الذمہ قرار دیتے تو میں اس سے تمہارا سر کچل دیتا۔''

معمار کو معاوضہ دیا گیا۔ یہ بڑا انوکھا معاوضہ تھا۔ مسجد سے متصل ایک پوری گلی۔

مسجد سادگی و پُرکاری کا نمونہ تھی۔ دراصل اصلی مسجد تو ترکی کے 1766 کے بدترین زلزلے میں تباہ ہوگئی۔ نئی فاتح مسجد 1771 میں سلطان مصطفٰے سوم نے بنائی۔ مسجد کا رنگ ڈھنگ تو استنبول کی باقی مسجدوں جیسا ہی ہے۔ ہاں البتہ مسجد کے اندر پینے کے پانی کا فوارہ ایک خوبصورت تحفہ ہے کہ گرمی سے پیاسے ہونٹوں اور اندر کو اس کے پانی سے جو راحت نصیب ہوئی اُس کا کوئی بدل نہ تھا۔ عربی خطاطی خوبصورت تھی۔

ڈیوڑھی سے گزر کر ہم اُس جیالے کی آخری گاہ میں داخل ہوئے۔ ہم دونوں عجیب سے محسوسات کی زد میں تھیں۔ محبت اور عقیدت کے جذبات نے پلکیں بھگو دی تھیں۔ انھیں ضرور بھیگنا چاہیے تھا کہ میرے آقا نے بشارت دی تھی۔

ترجمہ: تم فتح کرو گے قسطنطیہ کو۔ مبارک ہے وہ امیر جو اس شہر کا امیر ہوگا اور مبارک ہے وہ لشکر جو اس کا لشکر ہوگا۔

ماحول میں فسوں سا تھا۔ ہشت پہلو گنبد والی چھوٹی سی عمارت جس کی بلند و بالا دیواری کھڑکیوں پر تناشیڈ یا سائبان بڑی انوکھی وضع کا تھا۔ خوبصورت چوبی دروازوں کی دیواریں قرآنی آیات اور طلائی و رنگین نقاشی سے سجی تھیں۔ بلند و بالا دیواروں کے اوپری حصے میں بنی کھڑکیوں سے آتی روشنی اور مزار کے اوپر کسی پاسبان کی طرح تنے شیلنڈلیئر سے پھوٹتی شعاعیں سب مل جل کر کمرے میں دودھیا روشنی پھیلا رہی تھیں۔ آہنی جنگلے کی موتی جڑی باڑھ نے مرقد کو محبت سے جیسے سمیٹا ہوا تھا۔ سرہانے اُسکا سفید بل دار کلاہ ٹنگا ہوا تھا۔ سُرخ قالین پر چلتے ہوئے ہم نے پورا چکر کاٹا۔ فاتحہ پڑھی۔ ملحقہ تربت میں اس کی شریکِ زندگی گل بہار مٹی کا ڈھیر بنی پڑی تھی۔

یہیں اُس جیالے غازی عثمان پاشا کی بھی قبر تھی جو 1877 کی روس ترکی جنگ کا ہیرو تھا۔ رُوس بھی بڑا بد بخت ہے۔ ہمیشہ ترکی سے پنگے ہی لیتا رہا۔ بہت دیر تک یہاں رہے۔ دعائیں مانگتے کہ ایسے جیالے بطنِ اسلام سے پھر کب پیدا ہوں گے؟

کس قدر تاریخی اور کلاسیکل منظر مسجد سے باہر ہمارے منتظر تھے۔ بلند و بالا دروازوں والے بازار دکانوں، رنگوں، حسین چہروں سے بھرے پرے رعنائیاں بکھیرتے نظر آتے تھے۔ چلتے چلتے نظاروں سے آنکھیں لڑاتے اور ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں سلطان محمد فاتح کے بارے میں پڑھی گئی باتوں کو ذہن میں لا لا کر اسکے مختلف گوشوں پر بحث

کا بازار بھی گرم کرتے رہے۔

وہ بہت دلیر ،خداداد صلاحیتوں کا حامل ،بہترین منتظم ،عادل ،بہترین فوجی اور جنگی ماہر تھا۔

دو پینٹنگز یاد آئی تھیں جنہیں دولماباشی پیلس میں دیکھا تھا اور جن کے سامنے دیر تک کھڑے بھی رہے تھے۔سفید براق گھوڑے پر سوار اپنے لوگوں کے ہمراہ ایا صوفیہ میں داخل ہو رہا تھا۔دوسری 1473 کی جنگ اتلوک بیلی Otlukbeli کی تھی جس کے بارے تاریخ دانوں کا کہنا تھا کہ یہ پندرھویں صدی کی ٹیکنالوجی ،مین پاور اور جنگی حربوں کے لحاظ سے سب سے بڑی لڑائی تھی ۔جو اس نے لڑی اور فتح یاب ہوا۔اپنی وفات تک وہ اٹلی کے کچھ حصّوں پر قابض ہو چکا تھا۔

حافظ قرآن تھا۔احادیث میں بڑا مستند ،ریاضی اور علم نجوم میں ماہر ،عربی ،فارسی ،لاطینی اور یونانی زبانوں کا ماہر ،اور فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والا خاص طور پر شاعری سے۔

ایسے شاندار انسان نے اپنے سوتیلے چھوٹے بھائی کو مروا دیا تھا۔شاید تخت و تاج کی تاریخ میں ایسا ہونا ضروری ہوتا ہے ۔شاید لوح محفوظ میں یہ لکھا جاتا ہے ۔شاید حکمرانوں کیلئے ایسی سوچ رکھنا منفی اور ظالمانہ نہیں سمجھا جاتا ۔تاہم اُس نے اپنی اس سوچ کو قانون بنایا کہ سلطان کے جانشین بیٹوں کو اپنی حیثیت مظبوط اور مستحکم بنانے ،سلطنت کو ریشہ دوانیوں ،سازشوں اور رقابتوں سے بچانے کیلئے اپنے بھائیوں کو مار دینے کا اختیار ہوگا۔

کیا کہیں اس کے دماغ میں حضور اکرمؐ کی اُس حدیث سے متعلق کوئی ابہام تھا کہ جس کے بارے روایت ہے کہ ایک بار آپؐ نے فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل پر نبی حکومت کرتے تھے ۔ایک دنیا سے رُخصت ہوتا تو دوسرا اُس کی جگہ لے لیتا تھا۔لیکن میرے بعد

کوئی نبی نہیں آئے گا۔ہاں البتہ حکمران ہوں گے اور بہت ہوں گے۔ یہاں آپؐ سے سوال ہوا کہ اس ضمن میں آپؐ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں۔آپؐ نے فرمایا پہلے کے ساتھ عہد اطاعت کو پورا کرو۔پھر اس کے ساتھ جو اُس کے بعد پہلا ہو۔

یہاں ایک دوسری روایت کا حوالہ بھی ملتا ہے کہ جب دو حکمرانوں کی بیعت کا مسئلہ کھڑا ہوجائے اور مملکت میں فساد اور انتشار پھیلنے کا ڈر ہو تو دوسرے کو قتل کر دینا واجب ہے۔

ایسا حکم تو معاشرے کو انتشار سے بچانے کے سلسلے میں تھا۔وہ بھی کہ اِس صورت میں کہ اگر فریق ثانی کے ساتھ کچھ لوگ کھڑے ہوجائیں اور وہ فتنہ وفساد برپا کریں۔

یہاں صورت یقیناً مختلف بھی ہوسکتی تھی۔سلطان کو ایک لحظہ کیلئے یہ خیال نہ آیا کہ جانشین بیٹے کے علاوہ اُس کے بقیہ بچوں میں سے کوئی اور بھی بہت ارفع صلاحیتوں کا حامل ہوسکتا ہے جو توڑ جوڑ اور سازشوں کی سیاست سے تخت نشین ہوکر مزید سے زیادہ بہتر حکمران ثابت ہوسکتا ہے۔

ایک اور خدشے نے بھی ہمارے اندر سے سر اٹھایا تھا۔وہ شہرہ آفاق بدنام زمانہ اطالوی مفکر میکاولی بھی تو کہیں آگے پیچھے اسی دور کی پیداوار تھا۔اُس کی وہ شہرہ آفاق کتاب "The Prince" تو کہیں اُسنے نہیں پڑھی؟اور یہ میکیاولین ہتھکنڈے اُس نے وہاں سے تو نہیں سیکھے تھے کہ جس کے مطابق سیاست کا کوئی مذہب نہیں،اس کی کوئی اخلاقیات نہیں،اُس کے کوئی اصول نہیں۔

اب ہم دونوں نے تاریخ سے ڈھیروں ڈھیر مثالیں نکال کر اُسے بری تو کر دیا تھا۔مگر یہ وہ قبیح برائیاں تھیں جنہوں نے آگے چل کر سلطنت کو بہت نقصان پہنچایا۔اب ہمارے پاس کہنے کیلئے بس صرف ایک جملہ تھا۔

رموزِ مملکت دانند خسران

باب نمبر: ۱۰ مولانا رومی اور رقصِ درویشاں

۱۔ شمس تبریز جیسے مجذوب کا مولانا رومی کی زندگی میں داخل ہونا گویا مثنوی معنوی کو وجود میں لانے کا ایک خدائی اظہار تھا۔

۲۔ رقص درویشاں دراصل اپنے ہر عمل، اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی حرکت سے خدائی محبت اور اس تک پہنچنے کے روحانی سفر کی ایک دلآویز تمثیل ہے۔

۳۔ مولانا رومی نے تلاش کرنے والوں کو دل کی خوبصورتی، سچ کی خوبصورتی اور انسانیت کی خوبصورتی کی نوید دی۔

بروشر ریسپشن پر پڑے تھے۔آتے جاتے ہماری بھی عادت تھی لڑکے لڑکیوں سے گپ شپ کرنے، معلومات لینے، کچھ اپنے تجربات سنانے، کچھ اُن کے سننے تھوڑا سا ہنسی مخول، ترکوں اور استنبول کی تعریف میں تعریفی کلمات سے خوش کرنے کی کوششیں سب چل رہا تھا۔

بروشر ٹرکش میسٹک Mystic میوزک اور ڈانس کا تھا۔

''اچھا تو یہ وہ درویشوں کا رقص ہے۔جسے سیما Sema کہا جاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں کہہ لیجیے کہ روحانیت کے سفر کا بیان ہے۔''میں نے سیما کو دیکھا۔میری آنکھوں نے اُسے یہ بھی کہا ہاں تو کیا کہتی ہو؟''

''چلو قونیہ جانا شاید مقدر میں نہیں پر اسے تو دیکھ لیں۔''

اُس کی آواز میں قونیہ نہ جاسکنے کا قلق بڑا نمایاں ہوا تھا۔

اتوار، بدھ اور جمعہ۔ وقت دیکھا۔ جگہ پر نظر ڈالی۔ سرکیــــــجــــــی ٹرین سٹیشن۔ یورپ کا پہلا ریلوے اسٹیشن۔

''لو بھئی یہ تو نرا کوانڈ میں ہے۔ بیچ بیچ میں سے بھی چل کر وہاں جا سکتے ہیں۔ میٹرو سے تو پانچ منٹ کا فاصلہ ہے اور وقت بھی موزوں ہے۔

بس تو جہاں ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر نکل پڑے۔ بوڑھی ٹانگوں پر ترس کھایا اور میٹرو پر جا چڑھیں۔

ایونٹ ہال Event Hall میں پروگرام تھا۔ ہال بھی بڑا شاہانہ انداز کا تھا۔ دیواریں دیکھوں، دروازوں کو سراہوں۔ گردن کو عقبی سمت نوّے کے زاویے پر جُھکا کر چھتوں کی مدح سرائی کروں۔ کوئی تو بتائے آخر کروں تو کروں کیا۔ آنکھوں نے کہا۔

''عجب بونگیاں ہانک رہی ہو۔ معماروں کو سراہو۔ بس تو ڈھیر سارا خراج عقیدت انہیں پیش کر دیا۔

کرسیوں پر سارے غیر ملکی تھے سوائے ہم دو دیسی عورتوں کے۔ سازندوں کی پوری ٹیم بمعہ گانے والوں کے جنہیں مٹرپ Mutrip کہتے ہیں ساتھ ساتھ نشستوں پر بیٹھی حکم کی منتظر تھی۔ کچھ آلات موسیقی تو ہماری شناخت میں آئے۔ جن میں بنسری، رباب، ستار، دف، ڈرم فلیوٹ وغیرہ تھے۔ کچھ سے ہماری شناسائی نہیں تھی۔ مٹرپ سے آگے درویشوں کی ٹولی بیٹھی تھی۔

اب تک کی زندگی میں درود شریف کوئی ہزار بار پڑھا ہوگا، ہزار بار سُنا ہوگا مگر اُس نے کبھی وہ تاثر نہیں چھوڑا تھا جو اُس لحن داؤدی رکھنے والے شخص نے اُس فضا میں پیدا کیا۔ "سبحان اللہ" کہتے زبان خشک ہوئی جاتی تھی۔

دفعتاً ڈرم کی آواز نے ایک ڈرامائی تاثر کی فضا کو جنم دیا، جیسے خدا نے کہا ہو، پس

ہو جا۔

پھر فلیوٹ پر ایک مختصر سی نغمہ سرائی ہوئی ۔ یہ نغمہ جس نے رُوح کو دنیا کے حوالے کرنے کا پیغام دیا۔ جونہی یہ نغمہ سرائی ختم ہوئی درویشوں نے اپنے سروں کو جھکایا اور اپنے چوغوں کو اتارتے ، اپنی ایڑیوں پر گھومتے ، نیم وا آنکھوں سے دائرے میں داخل ہونا شروع کیا۔ پہلا درویش جونہی اندر آ کر رقص میں خود کو گم کر لیتا ۔ دوسرا رقص کرتا کرتا داخل ہوتا ، تیسرا ، پھر چوتھا ۔ یہ قدم انسانیت کی پیدائش کا عکاس تھا۔

درویشوں کے بازو اُن کے سینوں پر بندھے تھے۔ رقص میں یہ کھلتے گئے۔ دائیں ہاتھ اوپر اٹھتے گئے اور بائیں نیچے ہوتے گئے۔ یقیناً یہ اس خیال کا غماز تھا کہ ہم خدا سے لیتے ہیں اور انسانوں کو دیتے ہیں۔ ہمارے پاس کچھ نہیں۔

اور جب ہم اُس نیم روشن ہلکی سی خنکی والے ماحول میں نوجوان لڑکوں کے سفید فراکوں کے پھولے ہوئے گھیروں کو سراہتے اور انہیں ایک وجد کی سی کیفیت میں والہانہ گھومتے دیکھتے اور نہ سمجھ آنے والی زبان میں ایک مترنم آواز کو سنتے اِس سحر میں گم تھے تو کہیں یادوں کے دریچوں میں مولانا رومی کی جھلکیاں تھیں ۔ علامہ اقبال کی عقیدتوں کے قصے تھے۔ ان کی شاعری میں اُن کا اثر ، کہیں شمس تبریز کے حوالے ، کہیں ان کی ذات سے وابستہ معجزے سب ذہنی دنیا میں سب قطار در قطار چلے آ رہے تھے۔

سلیمانیہ لائبریری استنبول کی نوجوان انچارج مسز ایمل چیتن جو مولانا جلال الدین رومی کے بارے میں بات کرتے ہوئے بڑی واضح تھیں ۔ اُس کا کہنا تھا ہم اُن سے صرف اُن تراجم کے ذریعے متعارف ہوئے ہیں جو ہماری مختلف یونیورسٹیوں اور ذاتی طور پر لوگوں نے کیے ۔ اُن کا کام فارسی میں ہے جو عثمانی دور میں حکومت اور اشرافیہ کی زبان تھی۔ ترکی کے تمام دیہی علاقوں کے لوگوں کیلئے یہ زبان مشکل تھی اور وہ یہ زبان زیادہ بولتے

بھی نہیں تھے۔

دراصل اُن کی بہت زیادہ ہر دل عزیزی وسط ایشیا، ایران اور برِصغیر کے علاقوں میں ہے۔ گواب وہ انگریزی، جرمن، فرانسیسی زبانوں میں تراجم کے ذریعے باہر کی دنیا میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔

تاہم ہم تو یہ دیکھ رہے تھے کہ ترکی کے شہروں میں مولانا رومی کا رقص درویشاں، خدائی محبت اور اُس تک پہنچنے کے روحانی سفر کی دلآویز تمثیل اور لحن داؤدی جیسے آہنگ میں اُن کا کلام پڑھا جانا وہ خوبصورت چیز ہے جسکے لیے دُنیا بھر کے سیاحوں کے پُرے باقاعدہ بُکنگ کے مرحلوں سے گزرتے ہیں اور جم کر شوق و ذوق سے سب کچھ دیکھتے ہیں۔ بلا سے کچھ سمجھ آئے یا نہ۔ ہاں البتہ مختلف بین الاقوامی زبانوں میں چھپے پروشر زاپنا کردار عمدگی سے ادا کر رہے ہیں۔

تو وہ شاعر کیسے بنے؟ اُنکی شاعری اور اُن کے کلام میں سوز و درد، جلنے، تڑپنے اور آہ و فغاں کی کیفیات کیسے پیدا ہوئیں؟ وہ تو اِس منزل کے مسافر ہی نہیں تھے۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ شمس تبریز جیسے مجذوب کا ان کی زندگی میں داخل ہونا گویا دیوانِ شمس تبریز اور مثنوی معنوی کو وجود میں لانے کا ایک خدائی اظہار تھا۔ وہ نہ ہوتے تو مولانا سب کچھ ہوتے جیسا کہ وہ تھے۔ قرآن کو سینے میں سمونے والے حافظ، فقہ و حدیث، شریعت، طریقت میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے۔ اور استاد ایسے کہ چلتے چلتے بھی حکمت و دانائی کے موتی راستوں میں بکھیرتے جائیں پر شاعری کا تو کہیں دور دور تک سان و گمان تک نہ تھا۔

یقیناً وہ وقت کا منتخب لمحہ تھا جب قونیہ کی وہ عظیم صاحب علم ہستی جو اپنے آراستہ پیراستہ دیوان خانے میں شاہانہ کرّ و فر کے انداز میں اپنے طالب علموں کے ساتھ درس و

تدریس میں مگن رہتی تھی۔ لمحے بھر میں ہی اُس پھٹے پرانے ملبوس میں وہ کہ جس کے گرد آلود پاؤں ننگے تھے۔ بالوں کی اُلجھی ہوئی لٹوں میں مٹی تھی۔ چہرے پر دھول تھی کے دام گرفت میں آ گئی۔ اُس مجذوب نے انہیں اُس مسند سے اٹھا کر ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جو راگ ورنگ، ناچ گانے اور موج ومستی والا تھا۔ قونیہ کے لوگ پہلے حیرت زدہ ہوئے پھر کراہت اور نفرت کا اظہار کرنے لگے نہ صرف عام لوگ بلکہ عزیز رشتہ دار حتیٰ کہ سگی اولاد بھی۔

اب زندگی کا ایک بالکل نیا رُخ جو معاشرے کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ تھا سامنے آیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ یہی مقصود خداوندی تھا۔ یہ شمس تبریز ہی تھے کہ جس نے اپنے مرید کو اسرار ورموز اور طریقت کی تعلیم دی۔ روحانیت کی کٹھن گھیریوں میں ہر طرح اُلجھا کر اس کی منزلیں طے کروائیں۔ عشق حقیقی کے آداب سکھائے۔ قرب الٰہی سے آشنا کیا۔ آزمائش کی کسوٹیوں پر پرکھا۔

ظاہر بین لوگ جن کی ذہنی سطح بہت آگے کی چیزیں نہیں دیکھتی ہیں۔ وہ اِس تعلق کو سفلی سطح پر دیکھنے لگے تھے۔ جب کہ یہ سب خدائی منشاء کے تابع ہو رہا تھا۔ اس کی وضاحت ان دو واقعات سے ہوتی ہے جو شمس تبریز اور مولانا رومی کو پیش آئے۔

پہلا واقعہ اُس برگزیدہ شخصیت شمس تبریزی کے حوالے سے ہے کہ جس نے خدا کے حضور دُعا کی کہ اے پروردگار عالم تو نے مجھے مسند ولایت دی۔ اب میں تیرے عطا کردہ علم کو کسی ایسے انسان کو دینا چاہتا ہوں جسے تو پسند کرتا ہے۔ یہ دعا قبول ہوئی اور غیب سے آواز آئی کہ ایسا شخص تجھے تیرے شہر میں نہیں قونیہ میں ملے گا۔ تجھے اس کے پاس جانا ہوگا۔

اسی طرح مولانا روم کو بھی زمانوں پہلے ایک خواب میں ہی بشارت ہوئی کہ کوئی اُن سے کہتا ہے تم نے دینی اور دنیاوی علوم میں کمال حاصل کر لیا۔ تمہاری زندگی قابل تعریف ہے مگر تم معرفت اور طریقت کی منزل سے ناآشنا ہو۔ تمہاری روحانی تربیت کیلئے

ایک ایسا آدمی تمہارے پاس آئے گا جو معرفت میں کمال کے درجے کو پہنچا ہوا ہے اور ہمارا بہت پسندیدہ ہے۔نام شمس تبریزی ہے۔

بیدار ہونے کے بعد انہیں اطمینان قلب ہوا۔کیونکہ وہ خود بھی اس راستے کے مسافر بننے کے متمنی تھے۔فریدالدین عطار سے سرسری سی ملاقات اور ان کے "اسرارنامہ" نے ان کے اندر اِس جذبے کو ابھارا تھا مگر پھر درس و تدریس کی دنیا میں مصروفیت نے وہ خواب ایک طرح بھلا سا دیا تھا۔

اور جب وہ تاریخی ملاقات ہوئی۔اس وقت ایک دنیا دار صاحب علم انسان اپنے کرّوفر شاہانہ کے ساتھ ایک دلفریب ماحول میں تدریس میں محو تھا۔تبھی ایک مجذوب نے قریب آ کر کتابوں کو چھوتے ہوئے کچھ پوچھا۔آپ کو ایک خستہ حال انسان کا یوں آنا پسند نہ آیا۔رکھائی سے۔چیز یست کہ تو نمی دانی (یہ وہ چیز ہے جسے تو نہیں جانتا) کہا اور اندر چلے گئے۔

مجذوب نے کتابیں حوض کے پانی میں پھینک دیں۔واپس آ کر دیکھا اور ناراضگی کا اظہار کیا۔فقیر نے ہاتھ سے کتابیں نکال کر منڈیر پر رکھ دیں۔خشک کتابیں دیکھ مولانا نے حیرت بھرے انداز میں استفسار کیا۔مجذوب نے وہی جواب دہرایا۔چیز یست کہ تو نمی دانی۔(یہ وہ چیز ہے جسے تو نہیں جانتا)

خواب یاد آیا۔پوچھا۔شمس تبریزی ہیں آپ۔اثبات میں جواب دیا۔یہ وہ واقعہ تھا جسے کایا کلپ کی۔یہ شمس تھے جنہوں نے انہیں سخن کا شہنشاہ بنا دیا۔

یہ بھی خدائی منشا تھی کہ انہیں دنیاوی جاہ وحشمت سے نکال کر اُن میں عجز وفقر پیدا کیا جاتا اور ان کی ہستی کو عجز وفقر میں گوندھا جاتا۔

ایک دن وہ غائب ہو گئے۔یقیناً یہی وہ مقام تھا جو قدرت کے نزدیک منتہائے

مقصود تھا۔اس جدائی نے اُن کے اندر وہ آگ بھڑکائی کہ فریاد و نالہ شعروں میں ڈھل گئی۔مولانا کی آفاقی شاعری کا آغاز ہو گیا تھا۔دل کا درد شعروں کی صورت ڈھلنے لگا۔ مولانا روم شاعر بن گئے۔انہوں نے خود اس کا اظہار کیا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم

تا غلامِ شمس تبریزی نشد

مولوی یعنی میں ہرگز مولانا روم نہ بنتا اگر مجھے شمس تبریز کی غلامی نصیب نہ ہوتی۔

اب جب ہجر اور فراق کی آگ اندر جل اٹھی تھی۔ضبط کا یارا نہ رہا تو زبان اِس جلن کو اُگلنے لگی۔

میں نے سنا ہے آپ سفر کا ارادہ رکھتے ہیں

بخدا یہ سفر نہ کریں

آپ میرے ایک رقیب سے محبت کرنے والے ہیں

بخدا ایسا نہ کریں

آپ نے دنیا میں کبھی دُکھ، تکلیف اور رنجش نہیں دیکھی

پھر آپ دل کو تکلیف دینے والا عمل کیوں کرتے ہیں۔ایسا نہ کریں

ایسا نہ کریں

تصوف کی اِس بلندی نے اُن میں عجز اور خاکساری پیدا کی کہ جلال والی کیفیت ہی نہ رہی۔گالیوں، کوسنوں، لعن طعن سب چیزیں ان کے لیئے بے معنی ہو گئیں۔

دراصل مولانا رومی کے اندر شاعرانہ جذبات کی جو حس قدرت کی طرف سے عنایت تھی وہ مخفی تھی۔تبریز کی جدائی نے گویا ان سر بند جذبات کا منہ کھول دیا اور لاوہ یوں پھوٹ کر باہر آنے لگا کہ صدیاں گزر جانے پر بھی اِن اشعار کا کوئی بدل نہیں۔

ذرا دیکھیے اِن اشعار کو۔

اے دوستو تم جاؤ اور میرے محبوب کو لے کر آؤ

میرے بہانے باز محبوب کو ساتھ لے کر آؤ

اگر وہ وعدہ کرے کہ وہ پھر کسی وقت آئے گا

تو اس کے حیلے بہانوں پر مت جانا

یہ اشعار جن کی پور پور میں عشق مجازی کی جولانیاں نظر آتی ہیں ۔دراصل یہی عشق حقیقی کی حشر سامانیاں ہیں ۔شاعر کی ابتدائی شاعری کا آغاز جس دلآویز رنگ میں سامنے آیا۔اُسنے اُسے دنیا کی شاعری میں ایک منفرد انداز سے نمایاں کیا۔غزل کی بنیادہی عشق و محبت پر اٹھائی گئی ہے۔اور ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کا ہر شعر جذبوں کی گہرائی میں ڈوبا ہوا ہے۔اپنے اندر معنویت لیے ،صوتی اعتبار سے نغمگی لیے ،حُسن خیال کی فراوانی لیے اور فکر کی بلندی لیے اور یہی وہ خوبیاں ہیں جنہوں نے تغزل کو اوج کمال تک پہنچادیا۔

ذرا دیکھیے

ما خستگا نیم و توی صدمر ہم بیمار ما

ما بس خرابیم و توی ھم از کرم معمار ما

ترجمہ: ہم تھک کر خستہ حال ہوگئے ہیں تو ہی ہماری بیماری کا علاج یا مرہم ہے

ہم شکستہ حال ہیں اور تو ہی ہمارا بنانے والا ہے

مولانا روم کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے۔1207 میں بلخ جیسی سرزمین جو علم و دانش ،فکر و فن اور تہذیب و تمدن کا مرکز تھی ۔جہاں خود ان کا خاندان ان کے والد بہاؤ الدین ولد علم و دانائی ،زہد و پارسائی میں یکتا پورے علاقے میں معزز و محترم شمار ہوتے تھے۔درس و تدریس جن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔وہ علم کا دریا تھے ۔اُن سے ملنے کیلئے دور

دراز سے آنے والے بھانت بھانت کے لوگوں کا آنا ،اپنے مسائل پر راہنمائی چاہنا،کم سنی میں ہی سمرقند جیسے تاریخی شہر میں جانا اور وہاں قیام کرنا ،اس قیام میں اُنکا وقت صاحب علم لوگوں کے ساتھ ہی نہیں گزرا بلکہ خوازم شاہ کو شہر تاراج کرتے دیکھنا،لوگوں کا خوف و ہراس، واپسی کا سفر اور پھر اپنے شہر کے دیگرگوں حالات ۔ایک بار پھر ہجرت ۔نیشاپور، بغداد، شام، مکہ۔اِن شہروں میں قیام کے ساتھ ساتھ یہاں کی مقتدر ہستیوں سے ملاقاتیں ،باتیں بحث مباحثے یہ سب وہ تجربات تھے جن سے وہ اوائل عمری سے آشنا ہوئے ۔یہ اُن کی یادوں میں محفوظ ہوئے اور انہوں نے ان کی فکر کو جلا دی ۔یہ چیزیں ان کی شاعری کا حصہ بنیں تو لازمی بات ہے اظہار میں طغیانی جیسی شدت کا آنا عین فطری تھا۔

قونیہ آنا بھی زندگی کا ایک سنگ میل تھا۔

سلجوقی سلطنت کا پایہ تخت قونیہ جس نے اُن کا والہانہ استقبال کیا۔والد کی وفات کے بعد آپ نے علم بانٹنے کے عظیم سلسلے کو آگے بڑھایا۔تاہم اُس وقت تک مولانا رومی شاہانہ انداز زندگی کے خوگر تھے۔طلائی اور نقرئی تاروں سے کاڑھا گیا لباس پہنتے،بدن کو خوشبو میں بساتے ،اونچی مسند پر بیٹھتے اور ماحول میں کروّ فر کا رچاؤ ہوتا۔وہ وقت کے مفتی تھے۔شیخ تھے۔امام تھے۔

شمس تبریز جیسے مجذوب کا آپ کی زندگی میں آنا ایک ٹرننگ پوائنٹ تھا۔یقیناً خدا اُن سے وہ عظیم کام لینا چاہتا تھا جو مثنوی معنوی کی صورت میں ظاہر ہوا۔اُن کی قربت نے اُن میں صوفیانہ فکر کا وہ رنگ بھرا کہ وہ سب کروّ فر رخصت ہوئے ۔شب و روز رقص میں رہنے لگے۔دنیا حیران تھی اور نہیں جانتی تھی کہ انہوں نے باطنی دنیا کے اوج کمال کی معراج پائی۔

حقیقت یہ ہے کہ دیوان شمس تبریز غزلوں کا وہ خوبصورت مرقع ہے جسے فارسی

ادب کا نگینہ کہنے کی ضرورت ہے۔انہوں نے جو کہاوہ گویا ان کے اندر کی کہیں گہرائیوں سے اٹھ کر سامنے آیا۔ اسمیں تصوف کا ایسا کونسا پہلو ہے جو زیر مشق نہیں آیا۔

حسن و عشق کے موضوع کو جیسی پذیرائی مولانا کے کلام نے دی ہے۔اُس کی مثال ملنی بے حد مشکل ہے۔ذرا دیکھیے تو۔

اے یار ما ر دلدار ما، اے عالم اسرار ما

اے یوسف دیدار ما اے رونق بازار ما

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

اے شاد کہ ما ہستم اندر غم تو جاناں

ہم محرمِ عشق تو ہم محرم تو جاناں

ترجمہ: میں اس بات پر خوش ہوں کہ تیرے غم میں مبتلا ہوں

میں تیرے عشق کا رازدار ہوں اور میں اے میرے محبوب تیرا بھی رازدار ہوں

محبت، اُخوت، امن و بھائی چارہ ،صبر برداشت ان کی بنیادی تعلیمات تھیں۔اُن کی ذات کے گرد سنہرا ہالہ بننے اور ان کی شاعری کو زمانوں کیلئے اثاثہ بنا دینے والی۔

وہ کہتے ہیں محبت کرنے والے بن جاؤ۔اپنی ذات کی نفی کردو۔دل کو تخلیق کرنے والے سے بھرلو۔بس یہی اُس تک پہنچے کا مختصر ترین راستہ ہے۔جس کسی نے اپنا دل خدا کو سونپ دیا۔حقیقت میں اُس نے اپنی ذات کی مہار اُس کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔ان کی باتوں میں، اُن کی مثنوی معنوی میں زندگی جو بذات خود ایک متنوع اور لامحدود موضوع ہے۔اُس کا ہر ہر پہلو نہ صرف بولا بلکہ نمایاں ہوا۔عشق حقیقی کی رومانیت نے شعروں میں گھل کر ان کا حُسن بڑھایا۔

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

خدا سے اٹوٹ تعلق کی شیرینی نے لوگوں میں مٹھاس بانٹی۔وہ خدا کی آواز بنے اور انہوں نے تلاش کرنے والوں کو خوبصورتی تحفے میں دی۔دل کی خوبصورتی، سچ کی خوبصورتی، انسانیت کی خوبصورتی۔

لڑکے اپنے اپنے مدار کے اندر بے خودی کی کیفیت میں مبتلا گھوم رہے تھے، گھوم رہے تھے اور لگتا تھا جیسے وہ ایسے ہی گھومتے گھومتے فضا میں تحلیل ہو جائیں گے اور ساتھ میں ہم لوگ بھی۔

انہوں نے دل مسخر کرنے کو کہا۔انسان تو ساری تخلیق میں سب سے حسین اور قابل فخر ہے۔وہ کہتے ہیں۔اگر تم سمندر سے ایک جگ پانی کا بھرتے ہو تو جگ کتنا پانی اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے۔ایک دن کے گزارے کا۔تو جیسے سمندر جگ کی گنجائش کے مطابق اُسے بھرتا ہے تو ہماری رسائی بھی اوپر والے تک ہماری استعداد کے مطابق ہی ہے۔

رقص میں بے خودی اور مسلسل گھومنا بھی اُس حقیقت کی عکاسی ہے کہ جیسے چاند اور سیارے اپنے اپنے مدار پر گھومتے ہیں۔اسی طرح چکروں میں خدائی تعلق کے احساس کا عنصر کارفرما ہے۔

درویشوں کا نگاہیں اور گردن اٹھا کر اُوپر دیکھنا گویا خدا کی کائنات اور اُس کی دنیاؤں کی عظمتوں اور بڑائیوں کا اعتراف ہے۔رقص کے چکروں میں تیزی اور والہانہ پن اُس خدائے واحد کی لامتناہی کائنات کے درمیان اس کی ہستی میں خود کو گم کر دینے، مٹا دینے اور محبت کی معراج کو چھو لینے کا تصور ہے۔

اور پھر قرآن کی ایک سورت کے ساتھ یہ رقص ختم ہو جاتا ہے۔

ہم ایک ماورائی دنیا میں سانس لے رہی تھیں۔وہ دنیا جو زاہدوں اور عابدوں کی ہے۔خدا کی پسندیدہ ہستیوں کی ہے۔جس تک ہم گنہگاروں کی رسائی نہیں۔مگر سچ تو یہ ہے کہ

روحانی سفر میں ہستی کو فنا کر دینا ہی منتہائے مقصود ہے۔اُن سب کیلئے جو محبت کے راستے کے راہی بنتے ہیں اور جو اپنے اندر خدا کی تلاش کرتے ہیں۔خدا بھی انہیں نوازتا ہے۔آج دنیا کی کم و بیش ہر بڑی زبان میں مثنوی معنوی ترجمہ ہو چکی ہے۔اس ترجمے نے لوگوں کو روشنی دکھائی ہے۔اس کے بندوں کو بھٹکنے سے بچایا ہے۔انہوں نے کہا ہے۔

ایں جلالت در دلالت صادق است

جملہ ادراکات پس او سابق است

ترجمہ: خدا کی بڑائی اور شان اس کے ہونے کی سچی گواہی ہے

ہر شعور اور ادراک پیچھے رہ جاتا ہے

ہم بے شک قونیہ نہ جا سکے مگر یہ وقت ہم نے مولانا رومی کے ساتھ گزارا۔

واپسی میں جب میٹرو پر چڑھے تو ایک دلچسپ سا منظر دیکھنے کو ملا۔ایک نیا نویلا جوڑا اگلے سٹاپ سے سوار ہوا۔کیسی معصوم سی دُلہن اور دلہا بھی ایسا ہی۔ہمیں تو دیکھتے ہی کھد بُد ہونے لگی۔جوڑا شادی کے روایتی لباس میں ملبوس تھا۔کمپارٹمنٹ میں خاصا رش تھا۔ہم کھڑے تھے۔لڑکی کو میں نے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے قریب کرلیا۔انگریزی تو بڑی بات اُسے تو اپنی زبان میں بولنے کی ہچکچاہٹ تھی۔

اناطولیہ کے ایک دور افتادہ قصبے سے اپنے عزیزوں کے پاس آئی تھی۔ساتھ جو رشتہ دار عورتیں تھیں وہ کسی سٹوڈیو سے ان کی تصویر اُتروا کر آئی تھیں۔انگریزی میں وہ بھی کوری تھیں۔تاہم اُن میں سے ایک تھوڑا سا دال دلیہ کر لیتی تھی۔

جھلمل جھلمل کرتا لباس جو ایک فراک اور تنگ پائینچوں کی پھولی ہوئی بیگی نما شلوار کی صورت میں تھا۔سر پر ریشمی سکارف سا۔معلوم ہوا تھا کہ ترکی میں شادی کی تقریب پلاؤ زردے کی تقریب کہلاتی ہے۔دیہی علاقوں کی شادی کا دیکھنے سے تعلق

ہے۔روایتی لباس، ناچ گانے اور روایتی کھانے جن میں تر کی پلاؤ کے ساتھ ساتھ زعفران ڈلا زردہ اس تقریب کی خاص ڈش ہے۔

ہمارا اسٹیشن آ گیا تھا۔اُترنا پڑا۔جی چاہتا تھا اُس من موہنی سی لڑکی کو تھوڑا اور دیکھتے۔

باب نمبر:۱۱ استنبول کا قیمتی موتی مسجد سلیمانیہ، شاہی قبرستان

۱۔ پرانے استنبول کی گلیوں، بازاروں میں پھرنا اور پرانے وقتوں کی خوشبو میں چند لمحے گزارنا بڑا خوبصورت تجربہ تھا۔

۲۔ سلیمان ذی شان بچپن ہی سے ہمارے لیے دیومالائی کہانیوں کے کرداروں جیسا تھا۔

۳۔ تین برّاعظموں پر پھیلی ہوئی سلطنت کا فرماں نروا چھوٹے سے مزار میں سکڑا پڑا تھا۔

تاریخ ماضی قریب کے ملکوں کی ہو، ماضی بعید کے پتھر زمانوں کی یا مختلف ادوار کا ذکر ہو۔مطالعہ کرتے کرتے آپ کو کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی مقام پر کوئی نہ کوئی شخصیت ضرور موہ لیتی ہے۔آپ کے دل کے اندر اُتر جاتی ہے۔آپ کو اپنی شخصیت کے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔

خلافت عثمانیہ کی تاریخ پڑھتے ہوئے دو ہستیوں نے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ایڈرنے کا وہ بیس اکیس سالہ نوجوان سلطان محمد فاتح اور وہ سولہویں صدی کا اعلیٰ و ارفع سلیمان ذی شان جس کے گھوڑے کے سموں نے سارا مشرقی یورپ روندڈالا تھا۔عثمانی سلطنت دنیا کی عظیم ترین، مظبوط ترین اپنے انتہائے عروج کو پہنچی ہوئی۔

اوائل ستمبر کی اِس ڈھلتی شام میں ہم دونوں یعنی سیما اور میں جزیرہ نما استنبول کے بحیرہ مرمرا، آبنائے باسفورس اور سنہری خلیج کے پانیوں پر سے تیر کر آتی ہوئی ہواؤں کے جُھلاروں سے لُطف اندوز ہوتی اُسی ذی وقار سلطان سلیمان کی مسجد سلیمانیہ، اُس کا مقبرہ اور لائبریری دیکھنے جارہی تھیں۔یہ استنبول کی تیسری پہاڑی پر جو قدرے ڈھلائی صورت میں

ہے پر واقع ہے۔ اکثر جب ہم استنبول کے ایشیائی حصّے سے اس کے یورپی حصّے کی طرف آتے۔ کسی سٹیمر یا لانچ کے عرشے پر کھڑے جونہی گولڈن ہارن کے پانیوں کی طرف دیکھتے۔ یہ اپنے بے شمار خاکستری پُروقار گنبدوں کے ساتھ کسی ملکہ عالیہ کی طرح ہمیں نظر آتی جو اپنے دربار کی سب سے اونچی مسند پر تمکنت سے بیٹھی ہوئی جیسے کہتی ہو۔

''تم لوگوں نے مجھے کب دیکھنے آنا ہے؟ میں تمہاری منتظر ہوں۔''

میں محبت پاش نظروں سے اُس کے مرکزی گنبد کو دیکھتے اور زیر لب سرگوشی کے سے انداز میں اُسے مخاطب کرتی۔

''تم تو بہت خاص چیز ہو۔ تمہارے پہلو میں لیٹی ہوئی اُس عظیم ہستی کی محبت میں تو میں جکڑی ہوئی ہوں۔ بس آتی ہوں۔''

گذشتہ تین دنوں سے دوپہر کے بعد ہوٹل کے ریسپشن پر ایک پیاری سی، ہنس مکھ اور دوستانہ سے رویے والی لڑکی نظر آتی تھی جو مسکراہٹوں کی اُچھال کود میں بڑی ہی فیاض تھی۔ انگریزی کی بھی اچھی خاصی شدبُد رکھتی تھی۔ مشورے لینے میں اُسی کے دروازے پر جا کھڑے ہوتے تھے۔ اُسی نے راستہ دکھا دیا تھا۔

''ٹرام سے ایمی نونو تک جائیے۔ نئی مسجد کی عقبی گلیوں سے اندر ہی اندر سلیمانیہ مسجد تک زیادہ فاصلہ نہیں۔ کسی سے پوچھنا ہو تو سلیمان۔ یَئی کہیے۔ لوگ بتا دیں گے۔ ہاں مگر اس کی لائبریری کمپلیکس ضرور دیکھیں۔

استنبول کی دنیا کے کتنے رنگ تھے۔ ہر روز اس کا ایک نیا منفرد انداز سامنے آتا۔ مصری بازار راستے میں پڑا تو کیسے ممکن تھا اِسے دیکھے بغیر آگے بڑھ جاتے۔ چھتا ہوا، آراستہ پیراستہ دکانیں مگر بورے اور بوریاں بھی بڑھاوے والے پھٹوں کے ساتھ دھری تھیں۔ چہروں مہروں کی آرائش وزیبائش بھی کمال کی تھی۔ بازاروں کی مخصوص باس نتھنوں

میں گھسی جاتی تھی۔ ایک ہجوم تھا۔

آنکھوں کے سامنے تاریخ رقص کرنے لگی تھی۔ صدیوں پرانا بازار کوئی سولہویں صدی کے وسط کا جہاں وینس اور دوسرے شہروں کے ڈھیلے ڈھالے گھٹنوں اور ٹخنوں کو چھوتے لباسوں والے تاجر آکر منڈیاں لگاتے۔ جہاں مصر کے مصالحے بکتے۔

مجھے تو چیزیں یہاں سستی لگیں۔ بادام خریدے۔ پستہ لیا۔ پھولوں اور پھلوں کی منڈی بھی راستے میں دیکھی۔ پھلوں اور سبزیوں کی دنیا مالٹے، انجیر، انار، چکوترے ڈھیروں ڈھیر پڑے تھے۔ زور وشور کی آوازیں تھیں۔ سیب خریدے تو پتہ چلا کہ قونیہ کے ہیں۔

''ارے قونیہ جانا تو مقدر سے ہوگا۔ چلو پہلے اس کے سیب تو کھائیں۔''

تربوز بھی کیا جہازی سائز کے تھے۔ ہماری حیرت پر کسی نے کہا تھا۔

''ارے دیار بکر کے ہیں۔ شہد جیسے میٹھے اور کرکرے سے۔ کھائیں گی تو جنت کے پھل کا گمان ہوگا۔''

جی تو بڑا چاہا اوڑھنی اتاریں۔ بازو اوپر کریں اور کسی سے چاقو چھری مانگ کر ابھی یہیں جُت جائیں۔ آسمانی جنت کے پھل تو اوپر والے کی مرضی اور نظر عنایت ہوگی تو منہ میں جائیں گے پر اِس ارضی جنت کے مزے تو لوٹیں۔

پر یہ سیما جو ہے نا نری بیگم اِس فورکلاس عوامی مظاہرے پر رضامند ہی نہ ہوئی۔ اُس کے میرے چیڑ قناتیوں جیسے رنگ ڈھنگ اور سڑکوں گلیوں میں چلتے پھرتے منہ ماری سے ایٹی کیٹس کی الرجی شروع ہو جاتی تھی۔ ایک طرف سبزیوں کے ڈھیر تھے۔ سلاد کے پتے، چقندر، آلو، پیاز اور خوش رنگ چمکیلے بینگن۔

رات کا کھانا جس ریسٹورنٹ میں ہم کھاتی تھیں۔ اُس کا ویٹر ہمیں ہر روز ترکوں کے کھانے پینے کے ذوق وشوق اور پسندیدہ ڈشوں پر چلتے پھرتے چار لفظ بتاتا رہتا۔ بینگن

ترکوں کی ہی نہیں ہمارے سلطانوں کی بھی محبوب ومرغوب سبزی رہی ہے۔پتلیکن (بینگن) سے بیسیوؤں قسم کے کھانے بنتے ہیں۔

ہکابکا سی میں اپنے ہاں کی اس راندہ درگاہ جامنی رنگی سبزی کی عزت افزائی کے قصیدوں پر یہی کہہ سکتی تھی نا کہ بھئی دل آئے گدھی پرتو پری کیا چیز ہے۔

گھوڑا گاڑیاں، کھوتے، ریڑیاں سروں پر اٹھائے بڑے بڑے چھابے سب کچھ یہاں نظر آتا تھا۔ایک بدنظمی اور الجھی پھنسی مانوس سی دنیا جسے دیکھ کر اپنایت محسوس ہوئی تھی۔ ازمیر کی انجیر اور کشمش کا بھی بڑا شہرہ تھا۔تھوڑی سی وہ بھی خریدی۔یہیں قریب ہی پالتو پرندوں کی مارکیٹ بھی تھی۔

ایک چھوٹی سی ڈھلانی گلی سے گزرے۔کیا خوبصورت پرانے تاریخی گھر بلندو بالا بالکونیوں والے چوبی اور آہنی جنگلوں والے۔کہیں کسی میں کوئی عورت اور کہیں بچے کھڑے تھے۔کہیں پھول نظروں کو لبھاتے تھے۔کہیں خستگی درودیوار پر جھلکتی تھی۔ کہیں دُھلے ہوئے کپڑے اڑے ترچھے رُخ پرلگی تاروں پر سُوکھتے تھے۔کہیں تنگ گول پتھروں والی ڈھلانی سڑکیں تھیں، کہیں مڑتے کونے اور کہیں کشادہ راستے، کہیں کشادہ چوباروں کی بناوٹ اور کھڑکیاں بھی مختلف وضع کی جدید اور کہیں قدامت کا رنگ لیے۔کہیں رنگ وروغن نیانیا تھا اور کہیں سال خوردہ۔

پھر ایک خوبصورت منظر ہماری آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا۔ایک عظیم الشان تعمیراتی حسن مسجد کی صورت میں جاہ وجلال کی کرنیں پھینکتا پہلی بار دیکھنے والوں کے پاؤں ساکت کرتا تھا۔ہم ایک بڑے سے پختہ میدان میں کھڑی ہونٹوں پر چپ اور آنکھوں میں حیرتیں لیے ہوئے اُسے دیکھتی تھیں۔وسیع وعریض گرواؤنڈ میں اترتی شام کی نرم دھوپ میں بچے فٹبال کھیل رہے تھے اور شور مچاتے تھے۔

شام کے سورج کی زرنگار کرنیں درختوں اور بوٹوں میں گھس کر انہیں عجیب سی زرنگار رعنائی بخش رہی تھیں۔ آگے بڑھنے سے ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے بڑے اور اطراف میں چھوٹے چھوٹے مٹیالے رنگوں والے گنبدوں کے ساتھ وسیع وعریض باغ کے وسط میں تمکنت سے کھڑی مسجد اپنے بقیہ خدوخال کھولنے لگی تھی۔ اس کے چار مینار اس کے کونوں میں پاسبانوں کی طرح ایستادہ تھے۔ کسقدر مرعوب کن عمارت تھی۔

داخلہ مغربی جانب کے مرکزی صحن سے ہوا۔ صحن کو گھیرے میں لینے والے پورٹیکو کے گرینائٹ اور سنگ مرمر کے ستونوں کی خوبصورتی اور شان بڑی نرالی تھی۔ اندر جا کر تو اس کی گھمبیرتا، اس کا جلال و جمال اس کی متاثر کن رعنائیاں اور زیبائیاں یوں سامنے آئیں کہ بہت دیر تک ششدر سے کھڑے رہے۔ محرابی صورت لیے دودھیا شیشوں والی کھڑکیوں سے روشنیاں اندر آ رہی تھیں۔ فرشوں پر بچھے شوخ و شنگ قالینوں کی خوش نمائیوں نے براؤن ہلکے اور آف وائٹ رنگوں سے مل کر انتہائی دلکش تاثر ابھارا ہوا تھا۔

مسجد گرینائٹ اور سنگ مرمر کے ستونوں پر تعمیر ہے جسمیں محرابی صورت والے راستے شگافوں کی صورت نکل کر اس کی خوبصورتی دوچند کرتے ہیں۔ نقش و نگاری اور قرآنی آیات کی کندہ کاری بھی دلکشی بڑھاتی تھی۔ طاق اور دو محرابیں سفید پتھر کی ہیں۔ رنگین شیشے اور کھڑکیاں سولہویں صدی کے آرٹ کے نمائندہ ہیں۔ اس کے خالق سنان نے ایک بار کہا تھا۔ اس مسجد کی تعمیر نے اُسے بہت سارے تعمیراتی رموز سکھائے۔ کتنا بڑا اور عظیم کام۔

مسجد کے بارے میں دو باتوں کا انکشاف ہمارے لیے حیران کن تھا۔ ایک نوجوان جوڑا بھی اسے دیکھنے آیا ہوا تھا۔ بڑی دلکش لڑکی اور لڑکا بھی کچھ ایسا ہی اُس کے پلّے کا۔ استنبول کی جدید مضافاتی آبادی اورتا کوئے سے تھے۔ انگریزی میں اچھے رواں تھے۔ یہ دلچسپ بات انہی سے پتہ چلی کہ اس مسجد کی ایک اہم خصوصیت اس کے اندر بولے

جانے والی آوازیں نغمگی کا سا تاثر رکھتی ہیں ۔عصر کی نماز پڑھی ۔سجدوں میں کیسی عبودیت تھی ۔آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں ۔

مسجد کے پہلو میں سے ہی گزر کر ہم اُس عظیم شہنشاہ ،اس عظیم ہستی کا چھوٹا سا گھر دیکھنے چلے گئے ۔وہ ہستی جس کا رعب و دبدبہ تین براعظموں پر پھیلا ہوا تھا۔جس کی شجاعت اور دلیری کی داستانوں نے مغرب کو گنگ کیے رکھا۔محراب سے ملحقہ دیوار سے ملے ہوئے آیات قرآنی سے سجے کمرے میں سبز چادروں سے ڈھپا خاک کی ڈھیری بنا پڑا تھا۔

دل بوجھل سا تھا انسانی عظمتوں اور معرکوں کا انجام بس یہی دو گز زمین کا ٹکڑہ ۔کوئی سمجھے تو ۔بس ساری بات سرخروئی کی ہے ۔کون صدیاں گزر جانے پر بھی زندہ ہے اور دلوں میں بستا ہے ۔قریب ہی اُس کی محبوب بیوی حورم محو خواب ہے ۔جو ایک روسی کسان کی بیٹی اور سلیم دوم کی والدہ تھیں ۔ایک ذہین اور زبردست عورت جس کی مملکت کے کاموں میں مداخلت اور اثراندازی نے عثمانی تاریخ کو متاثر کیا ۔

سلیمانیہ مسجد کے شمالی جانب شاہی قبرستان میں اِس اتنی شاندار تعمیر کا خالق بھی سو رہا تھا۔ یہاں شاہی گھرانوں کے دیگر افراد بھی مدفون تھے ۔قبریں تھیں یا آرٹ کے شاہکار تھے ۔جو اسی کے دماغ اور ہاتھوں نے بنائے ۔فاتحہ پڑھی ۔سب کیلئے دعائے خیر کی ۔عمارات کی دنیا کا ایک عظیم نام سنان جو کہ Kayseri کے غیر مسلم گھرانے کا بیٹا تھا۔ اس کی تعمیر سلیمان ذی شان سے پہلے کے سلطانوں کے پرانے محلوں کو مسمار کر کے ہوئی ۔ جوڑا ہمارے ساتھ ہی تھا لڑکے نے میرے تاسف کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔آپ کو اس کے غریبانہ سے مقبرے کو دیکھ کر شاید دُکھ ہو رہا ہے ۔جانتی ہیں اُس نے کیا کہا تھا ۔

''اب ایک لکھنے والے یعنی ایک لکھاری اور بنانے والے یعنی معمار کے درمیان ایک خیال مشترکہ ہوتا ہے ۔میرا وجود فانی ہے ۔مگر میرا کام نہیں ۔لوگوں کو مجھے دیکھنے کی

ضرورت ہی نہیں ۔میرا کام جو ہے۔''

میں نے عظیم الشان مسجد کو دیکھا۔کیسی دانا بات ۔حکمت کے موتیوں سے بھری ہوئی۔ٹپ سے میری آنکھوں سے آنسو گرے۔ہاتھ دعا کیلئے اٹھے ۔سنان کیلئے۔ایک عظیم انسان ،ایک عظیم فنکار کیلئے ۔فاتحہ پڑھی ۔دعائے خیر کی۔اور یہ بھی سوچا کہ اسلامی فن تعمیر میں نئے رنگوں اور نئی تہذیبوں کا حُسن شامل کرنے والے نے ایک جاندار روایت ورثے میں چھوڑی کہ میرے وطن کے دو بڑے شہروں کے لینڈ مارک مینار پاکستان اور فیصل مسجد ترک ماہر تعمیرات کے مرہون منت ہیں۔

پھر باغ کی سیر کی۔اس سڑک کو دیکھا جو معمار سنان کے نام سے منسوب ہے۔شام کیسے اپنا حسن وہاں لٹا رہی تھی ۔یہاں کتنی طمانیت اور سکون تھا۔بلند و بالا درختوں کی نازک ٹہنیوں اور پتوں سے زور دار ہواؤں کی چھیڑ چھاڑ زوروں پر تھی ۔اب لائبریری دیکھنے کی بھی جلدی تھی کہ وہ کہیں بند نہ ہو جائے۔

باب نمبر:۱۲ سلیمانیہ لائبریری

۱۔ 1928 میں "حرفِ انقلاب" گویا شرح خواندگی کو بڑھانے کی ایک تیز ترین کاوش تھی۔

۲۔ صدیوں کے اُس عظیم الشان فکری وتہذیبی ورثے کو یونیسکو نے اپنے چارج میں لے لیا ہے۔

۳۔ بوعلی سینا کی "کتاب الشفا" اولیاء آفندی کا سفرنامہ اور دیگر مشاہر کے فکری خزانے دیکھنا ہمارے لیے کتنی مسرت کی بات تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ سلیمانیہ لائبریری میں جانا اور ایک ہزار سال سے زیادہ کے ترک اسلامی کلچر کے فکری وعلمی خزانوں کے مخطوطوں اور مسودات کو دیکھنا گویا اپنے آپ کو اس علمی ماحول میں تھوڑی دیر کیلئے محسوس کرنا اور سانس لینا ہی خدا کی ہمارے اوپر ایک بڑی عنایت تھی۔

اس عظیم الشان ورثے کے سامنے جب میں کھڑی تھی ایک تلخ اور حقیقت پسندانہ سوچ بھی ذہنی دروازہ کھولتی اندر آئی تھی۔ قومیں جب عروج پر ہوتی ہیں تو پھر طب ہو، انجینیر نگ ہو، ادب یا فنون لطیفہ ہر شاخ پھلتی پھولتی اور پھلوں پھولوں سے لدتی اور نوازتی چلی جاتی ہے۔ سلیمانیہ دور بھی ایسا ہی تھا جب دل اور دماغ نے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر مشرق ومغرب کی فکری رسائی حاصل کی۔

استنبول کی سلیمانیہ لائبریری کمپلیکس استنبول کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ مسجد سے ایک تنگ اور لمبا سا راستہ مدرسے اور لائبریری تک جاتا ہے۔ لائبریری الگ ہے اور قدیم علمی خزانے کو محفوظ رکھنے کا شعبہ الگ کردیا گیا ہے۔ اِسے پہلا کتابی شفا خانہ کا نام دے

لیں ۔ پہلے ہم اسی جانب گئیں ۔اندر جا کر معلوم ہوتا ہے کہ کس وجہ شاندار انتظامات اِن مخطوطوں اور مسودوں کی حفاظت کے کیلئے کیے گئے ہیں۔جن کے اندر نوّے فیصد (90%) ترک اسلامی دنیا اپنے ثقافتی خزانوں اورافکار کے موتیوں کی صورت عربی اور فارسی رسم الخط میں کاغذات پر بکھری ہوئی ہے۔

لائبریری کو جب سے یونیسکو unesco نے اپنے چارج میں لیا ہے اسے جدید خطوط پر محفوظ اور استوار کیا جارہا ہے۔ سیما اور میرے لیے کیا یہ کسی اعزاز سے کم تھا کہ ہم طب کی دنیا کی اُس عظیم ہستی بوعلی سینا جسے مغرب Avicenna کہتی ہے کی طبی کتابیں اس کی اپنی تحریر میں لکھی دیکھتی تھیں ۔کتاب الشفاء میرے سامنے شوکیس میں دھری تھی۔ جس کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ اُسکے کچھ حصّوں کو پھپھوندی نے نقصان پہنچایا تھا۔بہت سے صفحات آپس میں جڑ گئے تھے۔اور وہ علیحدہ کرنے کی کوشش میں پھٹ رہے تھے۔ہر جدید حربہ استعمال میں لا کر انہیں محفوظ کر کے نئی صورت دی۔

سلیمان ذی شان کی مہر لگی کتنی بہت ساری اہم دستاویزات اور اولیا ء آفندی کا سیاحت نامہ۔

جذباتیت نے آنکھوں کو گیلا کر دیا تھا۔

لائبریری کے ڈائریکٹر Nevzat Kaya ہماری خوش قسمتی سے اُس وقت موجود تھے۔انہوں نے فریم کیے ہوئے منصور بن محمد احمد کی انسانی اعضاء کی ڈرائنگ دکھائی۔عثمانی دور کے عالم بشیر آغا کے نباتات سے بننے والی دوائیوں کے منی ایچر پینٹنگ اور ان کی عربی تحریر میں مسودہ بھی نظروں کے سامنے تھا۔تھوڑی سی اس کی تاریخ پر بھی انہوں نے روشنی ڈال دی۔

1918 میں جب اندرونی ابتر حالات کی وجہ سے حکومت کی لائبریریوں پر وہ

توجہ نہ رہی تو اِس سارے سرمائے کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا۔اس میں ترکی کے بہت سارے اضلاع خاص طور پر اناطولیہ نے بہت کردار ادا کیا۔یہ تہذیبی سرمایہ پتھروں پر کندہ کاری اور کاغذوں پر تحریری صورت میں سامنے آیا۔یہ بلقان سے ایشیا اور افریقہ مراکش سے ہندوستان ،ترکستان سے یمن تک کا نوّے فیصد (90%) فکری سرمایہ جہاں جہاں جس جس جگہ موجود تھا اکٹھا کر کے اُسے یہاں محفوظ کیا گیا۔ملک بھر میں صاحب علم و دانش لوگوں نے اِس کارِخیر میں حصّہ لیا۔

اسی طرح ہزار سال سے بھی زیادہ کا ترک اسلامی ثقافتی ورثہ 117022 جسمیں 67350 مسودات کی صورت اور 49663 کتابوں کی شکل میں اِسے ہنگامی اور سائنسی بنیادوں پر منظّم کیا گیا۔پہلا بک ہوسپٹل بنایا گیا۔1950 سے یہ سلسلہ شروع ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اتنی ڈھیروں ڈھیر قیمتی اور نادر کتابیں دیکھنا ہمارے لیے بڑی سعادت تھی۔وہاں خزانے تھے جنہیں ہم جیسے علم سے بے بہرہ لوگ سمجھنے سے قاصر تھے۔

ہم مختلف کمروں میں گئے۔جہاں ہم نے انہیں جدید شوکیسوں میں رکھے دیکھا۔پھٹے ہوئے کاغذات کی چرمی جلدیں کرنے ،انہیں محفوظ کرنے ،انہیں کیڑوں سے بچائے رکھنے کیلئے جدید طریقے استعمال ہو رہے ہیں۔یہاں مائیکروفلم سروس ،جلد بندی اور پتھالوجی سروس ہوتی تھی۔کام جدید بنیادوں پر ہو رہا ہے۔پھٹے پرانے مسودات ،اہم کاغذات اور دستاویزات ان کی بھی مرمت کہیں ان کی جلدیں ،کہیں چرمی اور کہیں عام کیڑوں سے بچانے کیلئے اُن کا علاج اور سپرے۔پھر انہیں نمبر لگا کر ترتیب سے شوکیسوں میں رکھنا یہ بھی کچھ اس اثاثہ کو محفوظ رکھنے کیلئے کیا جارہا ہے۔

جب ہم ان کے کمرے میں بیٹھے قہوہ پیتے تھے میں نے سوال کیا تھا کہ وہ کیا سمجھتے

ہیں ترک زبان کا رسم الخط تبدیل کرنے سے ترک قوم کی نئی نسل قدیم، عظیم، تہذیبی، ثقافتی اور روحانی ورثے سے محروم نہیں ہوگئی۔ یہ اثاثہ عربی رسم الخط کی صورت لیے بند الماریوں، شوکیسوں میں کتابوں اور مخطوطوں کی صورت سجا ہوا ہے۔ جن کے صفحات پر حکمت و دانائی کے موتی بکھرے ہوئے ہیں اور انہیں چننے والے نہیں۔ ترک زبان کا رسم الخط تبدیل کر کے ترک قوم کو اس کے ماضی سے کاٹ کر نہیں پھینک دیا ہے۔

انہوں نے قہوے کا گھونٹ بھرا اور متانت سے کہا۔

کسی حد تک آپ کی بات سے مجھے اتفاق ہے کہ ہمارے بچے اُس سب سے نا آشنا ہیں جو ہماری وراثت ہے کیونکہ میرے ذاتی تجربے کے مطابق جو کچھ بھی ہم ترجمہ کر کے شائع کرتے ہیں اسمیں غلطیوں کے بہت سے امکان ہوتے ہیں۔ چلیئے وسائل کی فراہمی تو کسی نہ کسی انداز میں ممکن ہے۔ مگر مسئلہ وقت اور تیز رفتاری کا ہے۔ دنیا بڑی سرعت سے آگے بڑھ رہی ہے۔

چند لمحوں کیلئے وہ رکے۔ انہوں نے دھیرے سے شیشے کی چھوٹی سی گلاسی سے قہوے کا آخری گھونٹ بھرا اور اُسے ٹیبل پر رکھتے ہوئے گفتگو کو جوڑا۔

1928 میں "حرف انقلاب" کا آغاز ہوا۔ اس وقت ترکی کی شرح خواندگی افسوسناک حد تک کم تھی صرف بارہ فیصد۔ اتاترک جیسا وژن رکھنے والا لیڈر اس امر سے آگاہ تھا کہ ملک کو ترقی کی شاہراہ پر ڈالنے کیلئے قوم کا پڑھا لکھا ہونا کتنا ضروری ہے۔ دراصل عثمانی ترکوں نے زبان کو مشکل بنا دیا تھا۔ فارسی اور عربی کا ذخیرہ الفاظ شامل کرنے سے یہ عام آدمی کیلئے مشکل ہوگئی تھی۔ رسم الخط بھی عربی میں تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم ترکی زبان کا اپنا رسم الخط کوئی نہیں تھا۔ قسطنطنیہ، ایشیائے کوچک اور ترکستان کے ترکوں نے مسلمان ہونے کے ناطے عربی رسم الخط کو اپنایا۔ تب ان کے پیش نظر اسکے آسان یا مشکل ہونے کا

مسئلہ نہ تھا۔

یہ کریڈٹ بہر حال اتاترک کو جاتا ہے کہ اس کے تیز ترین اقدامات نے ترک قوم کو قلیل عرصے میں 60% کی شرح پر پہنچا دیا تھا۔بہر حال یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اتاترک کے چاروں اہم رفقاء میں سے کسی حد تک بھی مگر خصوصی طور پر عصمت انونو کے پیش نظر نئی ترک نسل کو اسلام کے دائرہ اثر سے باہر نکالنا بھی تھا۔اس کا اظہار انہوں نے اپنی بائیوگرافی میں کیا ہے۔تاہم یہ بھی وقت کا تقاضا تھا کہ ہم اور ہماری زبان جدید رجحانات سے اپنا دامن بھرتی۔مغرب نے علم کو،ادب کو،گونا گوں تجربات سے مالا مال کر رکھا ہے۔مشرق فکری طور پر انحطاط کی طرف مائل ہے۔فکری سوتے تو مغرب سے پھوٹ رہے ہیں۔

میں چاہتی تھی کہ اپنی ناقص عقل کے مطابق اس کا جواب دوں کہ یہ بھی تو دانائی نہیں کہ صدیوں پرانے اپنے اثاثے منجمد کردیں۔تاریخ میں جھانکا جائے تو معلوم ہوگا کہ اب نئے عزمیوں کے حصول کیلئے لاطینی رسم الخط کی طرف لپک پڑنے کی بجائے اپنی ہی چیزوں کو نئے رنگ دینے،انہیں نئے سانچوں میں ڈھالنے اور بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اُسے مزید مالامال بھی تو کیا جاسکتا تھا۔میں بہت سے ملکوں کے نام لینا چاہتی تھی جو ترقی یافتہ ہیں۔جن کی زبان مشکل ہے جیسے جاپان،چین اور اسرائیل۔خیر اسرائیل نے تو کمال ہی کیا کہ جس نے اٹھارہ صدیوں سے نہ بولنے والے عبرانی جیسی مردہ زبان کو زندہ کرکے اپنے ماتھے پر سجالیا۔

مگر میں چپ رہی۔میں تیسری دنیا کے ایک شورش زدہ ملک کی باسی ایسے اہم فیصلوں کی گہرائی کیا جانوں۔

باب نمبر:۱۴ ترکوں کا محبوب و مقبول شاعر

یونس ایمرے Younus Emre

۱۔ ہماری نئی نسلیں اُن عظیم شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہیں جنہیں ہم ترجمہ نہیں کر سکے۔

۲۔ یُونس ایمرے کے ہاں ذریعہ اظہار دیہی علاقوں میں بولی جانے والی ترکی زبان تھی۔ شاید اسی لیے وہ ایک عوامی شاعر ہیں۔

۳۔ یُونس ایمرے کا کہنا ہے دینِ حق سر میں ہے۔ سر پر رکھی جانے والی پگڑیوں اور دستاروں میں نہیں۔

ہم لائبریری میں آ گئیں۔ یقیناً دل چاہتا تھا تھوڑا سا وقت اور یہاں گزارا جائے۔ لائبریری کی انچارج مسز ایمل بہت سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ سکارف پہنے ہوئے تھیں۔ باتیں ہونے لگیں تو احساس ہوا کہ سوچ اسلامی فکر میں گندھی ہوئی ہے۔ ان کے ہاں یہ تاسف بھرا اظہار تھا کہ ہماری نئی نسلیں اُن عظیم شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے بارے نہیں جانتی ہیں جنہیں ہم ترجمہ نہیں کر سکے۔ ہمارا شاندار ماضی تو جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے۔ بازاروں محلوں عجائب گھروں کو چھوڑیئے ہمارے تو قبرستان بھی ہمارا اثاثہ سنبھالے ہوئے ہیں مگر انہیں پڑھنے والے نہیں۔

وہ ہمارے جذبات کو زبان دے رہی تھیں۔ میں نا امید نہیں۔ ایک دن وہ وقت ضرور آئے گا جب ہمیں اپنی عثمانی ترکی زبان کی عظمت کا احساس ہوگا۔ جب یہ ایک مضمون کے طور پر سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائی جائے گی۔ ہمارے امام

حاطب (مذہبی) سکولوں میں تو یہ نصاب کا ایک حصّہ ہے۔مگر اِسے اسکا جائز حق ملنا چاہیے۔

ہمارے امین کہنے میں ہماری دلی تمنائیں شامل تھیں۔

باتوں کی اس بحث میں اچانک یونس ایمرے Yunus Emre کا ذکر آگیا۔خاتون نے اناطولیہ کے اِس درویش،صوفی اور خداداد صلاحیتوں کے حامل شاعر کا ذکر جس محبت اور شوق سے کیا اُس نے آتش شوق کو گویا بھڑکا سا دیا۔انہوں نے ان کی عوامی اور وحدت میں ڈوبی ہوئی شاعری کے چند ٹکڑے سُنائے اور ایک دلچسپ واقعہ بھی۔

زمانہ تو مولانا جلال الدین رومی کا ہی تھا۔کہتے بھی انہیں رومی ثانی ہے مگر دونوں عظیم شاعروں میں فرق ذریعہ اظہار کا تھا۔

مولانا رومی کا کلام اُس وقت ترکی کی شہری اشرافیہ کی مروجہ ادبی زبان فارسی میں ہونے کی وجہ سے خاص الخاص تھا جبکہ یونس Emre کے ہاں ذریعہ اظہار اُن کی عام لوگوں کی یعنی دیہی علاقوں میں بولی جانے والی ترکی زبان میں ہی تھا۔زبان سادہ،مفہوم واضح،تشبیہیں استعارے عام فہم اور زبان زدعام ہونے والے کلام میں غنائیت اور نغمگی کا بہاؤ اِس درجہ تھا کہ صوفیاء کی محفلوں میں جب گایا جاتا تھا تو لوگ وجد میں آجاتے تھے۔یونس ایمرے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت شریں گفتار اور لحن داؤدی کا سا کمال رکھتے تھے۔کبھی اگر دریا کے کنارے قرات سے قرآن پاک پڑھتے تو بہتا پانی رک جاتا تھا۔

بہت دلچسپ ایک واقعہ بھی سُن لیجیے۔یونس اُمرے کے قونیہ سفر کے دوران کہیں مولانا رومی سے ملاقات ہوئی تو مولانا نے اُن سے اپنی مثنوی کے بارے میں دریافت کیا۔یونس ایمرے نے کہا۔"بہت خوبصورت،بہت عظیم،بہت اعلیٰ شاہکار۔میں مگر اِسے

ذرا مختلف طریقے سے لکھتا۔"مولانا نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا"بتاؤ ذرا کیسے۔"یونس بولے۔"میں آسمان سے زمین پر آیا۔گوشت پوست کا لباس پہنا اور خود کو یونس ایمرے کا نام دیا۔"

ترکی کے اس مقبول اور اہم ترین شاعر کا زمانہ لگ بھگ 1238 تا 1320 کا ہے۔مقام پیدائش صاری کوئے نامی گاؤں میں ہوئی۔اس زمانے میں قونیہ پر سلجوق ترکوں کی حکومت تھی۔

مولانا رومی شمس تبریز سے متاثر تھے۔ایسے ہی یونس ایمرے نے چالیس سال اپنے استاد شیخ تاپدوک ایمرے Tapduk Emre کے قدموں میں گزار دیئے۔اُن کی زیر نگرانی انہوں نے قرآن و حدیث کے علم میں کمال حاصل کیا۔طریقت کے اسرار و رموز سے شناسا ہوئے۔اُن کے کلام میں رباعی، گیت، نظمیں، غزلیں سبھی نظر آتی ہیں۔ذرا دیکھئے کلام کی سادگی اور حُسن۔

ایک لفظ ہی چہرے کو روشن بنا سکتا ہے
اُس شخص کیلئے جو لفظوں کی قدر و منزلت جانتا ہے
جان لو کہ لفظ کب بولنا ہے اور کب نہیں
ایک اکیلا لفظ دنیا کی دوزخ کو آٹھ بہشتوں میں بدل سکتا ہے

یونس ایمرے اِس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان کو زندگی محبت و پیار کے اصولوں پر گزارنی چاہیے۔ان کی فلاسفی میں اُونچ نیچ اور تفریق کہیں نہیں۔یہ صرف انسانوں کے اعمال ہیں جو انہیں اچھا یا بُرا بناتے ہیں۔زندگی عفو و درگزر، حلیمی اور رواداری جیسے جذبات کے تابع ہونی چاہیے۔ان کا عقیدہ تھا کہ خدا تک پہنچنے اور بخشش کا راستہ اکابرین دین، مختلف مذہبی اور مسلکی فرقوں کے اماموں کے ذریعے نہیں بلکہ یہ انسان دوستی اور احترام

انسانیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ہر مذہب اور ہر مذہبی فرقے کا دوسرے کو جہنمی کہنا اور سمجھنا بہت غلط ہے۔ دنیا کا ہر مذہب انسانیت کی بھلائی کا درس دیتا ہے۔ ان مذاہب اور انسانوں کے احترام سے خدا سے سچا عشق پیدا ہوتا ہے۔ ان کا یہ کہنا کتنا خوبصورت ہے۔ دینِ حق سر میں ہے سر پر رکھی جانے والی پگڑیوں اور دستاروں میں نہیں۔ ذرا دیکھیے وہ کیسے کہتے ہیں۔

تم اگر دوسروں کو نفرت سے دیکھو گے   بلندی سے نیچے گر جاؤ گے
وہ کہ جس کی لمبی سفید داڑھی ہے   اور جو خاصا معقول نظر آتا ہے
اگر اُسنے کسی ایک کی بھی دل شکنی کی   تو بلا سے وہ مکہ جائے کچھ فائدہ نہیں

ایک اور جگہ کہتے ہیں

اگر سب مذاہب مل کر ایک اکائی کا روپ دھار لیں
تو اِس امتزاج سے عشق حقیقی پیدا ہو گا

ذرا اس شعر کو دیکھیے۔

خواہ کعبہ ہو، مسجد ہو یا کوئی اور عبادت گاہ
ہر ایک اپنی اپنی بیماریاں اٹھائے ہوئے ہے

زندگی کے کڑے حقائق، روایتی اور کھوکھلی مذہب پرستی اور اُس کی آڑ میں انسانوں کا استحصال۔ یونس نے اپنی ذات کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ خود اپنے آپ کو رگیدا۔ اپنے آپ پر ملامتوں کے کوڑے برسائے۔

یونس ایمرے عشقِ حقیقی کے پرستار اور اسیر تھے۔ شاعری میں صوفیانہ علم، عجز و انکسار اور انسانیت کا بے پناہ جذبہ نظر آتا ہے۔

میں یہاں رہنے کیلئے نہیں آیا   میں تو رُخصت ہونے کیلئے آیا ہوں

میں مسائل پیدا کرنے کیلئے نہیں   میں صرف محبت کیلئے آیا ہوں

ان کی شاعری میں جابجا وحدت الوجود کا اظہار ملتا ہے۔

یہ خاک کا پیکر نہیں تھا

میرا نام تو یونس بھی نہیں تھا

میں وہ تھا اور وہ میں تھا

متاعِ عشق جب اُس نے عطا کی

تو اس لمحے میں اس کے پاس ہی تھا

یونس ایمرے ترکوں میں بہت ہر دل عزیز ہیں۔ دراصل اُن کی شاعری ترکوں کے قومی مزاج کی خوبصورت عکاس ہے۔ ترک قوم کی دلیری اور خودداری کا اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار خاص و عام کی زبانوں پر ہیں۔ بیرونی دنیا میں اب ان پہچان ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ دراصل اُن کا کلام اپنی مادری ترکی زبان میں ہے۔ ان کے ہم عصر مولانا رومی کا کلام فارسی میں ہونے کی وجہ سے وہ برصغیر اور وسط ایشیا کی ریاستوں میں بہت زیادہ ہر دل عزیز ہیں۔ تاہم اب انگریزی ترجمے کی وجہ سے یونس ایمرے کے قارئین ان کی خداداد صلاحیتوں سے آگاہ ہو رہے ہیں۔ اُن کے فن اور کلام کی سادگی، برجستگی اور فلسفے سے واقف ہو رہے ہیں۔

ہم بھی شکر گزار ہوئے کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا اور ہمیں ایک عظیم ہستی سے ملوایا۔

باب نمبر:۱۴ استقلال سٹریٹ اور تقسیم میدان

۱۔ استقلال سٹریٹ استنبول کا دل ہے۔
۲۔ اتاترک کا پڑھایا ہوا سبق کام، خود پر اعتماد اور اپنی قوم پر فخر ترکوں نے اچھی طرح سے پڑھا ہے۔
۳۔ اسلام کو وقت اور دنیا کے بدلتے ہوئے رجحانات کے حوالے سے ترکی کے اسلامی مفکروں نے اسے عمدگی سے پیش کیا ہے۔
۴۔ سعید نورسی ہوں یا فتح اللہ گلین یہ لوگ رفتار مست تحریکوں کے بانی ہیں۔

تھکاوٹ دُور کرنے کا بہترین گُر ہمارے ہاتھ آ گیا تھا۔دن بھر کی آوارہ گردی کرنے کے بعد شام کو ہمارے لیئے کسی بھی بس،میٹرو یا ٹرام میں بیٹھنا اور اردگرد کے نظارے لوٹنا ہوتا۔نہ ہماری کوئی منزل ہوتی، نہ ہمیں اُترنے کی کہیں جلدی ہوتی۔بس دو کاموں کا ضرور دھیان رکھتے۔جہاں اُترے ہیں اس کے قریب قریب رہنا ہے۔اگر ذرا دُور تک جانا ہے تو گردو پیش کے نظاروں میں کھونے کے باوجود ہر صورت اپنی اپنی آنکھیں اور دماغ کو کھول کر رکھنا ہے۔اردگرد کی نمایاں علامتی جگہوں کو دو تین بار دہرانا ہے۔تاکہ واپسی میں شناخت کا حوالہ رہیں۔اِس دلچسپ کام نے کافی حد تک مدد کی تھی۔گو کبھی کبھی بونگیاں بھی ماریں۔

بسوں کی کھڑکیوں سے ہم نے بیگلو Beyoglu کا علاقہ دیکھا۔یورپی حصّے کو دو ٹوٹوں میں تقسیم کرنے اور اس کے اندر دُور تک گھس جانے والی شاخ زریں کے چاروں پلوں جو دونوں یورپی حصّوں کو ملاتے ہیں۔گلاتا،اتاترک، پرانا گلاتا اور ہیلک Halic پر

سے ہم نے اِن علاقوں کا حُسن شام کی خوبصورتیوں میں جیسے تحفے کے طور پر وصول کیا۔

کھڑکیوں سے رنگا رنگ منظر یوں آنکھوں کے راستے اندر گھستے کہ سارا وجود حسن کی اِس بارش میں بھیگ سا جاتا۔ پلوں پر سے گزرتے ہوئے ایک جانب اگر پانیوں پر سورج کی طلائی کرنیں دلفریب نقش بنا رہی ہوتیں تو وہیں پانیوں پر تیرتی پھرتی کشتیاں، سٹیمر اور لانچیں اِن نقوش میں رنگ بھرتیں۔ سامنے اور دائیں بائیں کی پہاڑیوں پر سُرخ کھپریل کی چھتوں والے بادامی اور اف وائٹ اوپر نیچے ایک منظم ترتیب میں بکھرے ہوئے گھر، درخت، سبزہ، میدانوں اور پارکوں میں کھیلتے بچے اور بڑے اس شعر کا غماز بن جاتے۔

دامن دل فی کشد کہ فردوس ایں جا است

بیگلو میں زیادہ عیسائی اور یہودیوں کے گھر ہیں۔

کیراکوئے karakoyo اور بیگلو Beyoglu کے درمیان اُس ٹنل کو دیکھنا بھی دلچسپ تجربہ تھا کہ یونہی ایک شام ایمی نونو بیٹھے بیٹھے فیری کے ہُوٹے لینے کو جی مچلنے لگا۔ استنبول کی شاموں میں ہمارے دل اکثر بالک ہٹوں پر اُتر آیا کرتے تھے۔ ایمی نونو سے کشتی میں بیٹھے اور گلاٹا پُل کے پار کیراکوئے Karakoyo کی جیٹی پر جا اُترے۔ تھوڑا آگے ایک عمارت میں ساز بجتے تھے۔ لگتا تھا جیسے موسیقی کا کوئی پروگرام ہو رہا ہو۔ گیٹ کیپر نے ہماری درخواست پر دروازہ کھول دیا۔ ایک بڑے سے ہال میں نوجوان بچے بچیاں ڈانس کرتے اور موج مستی کی سی کیفیت میں تھے۔ ہماری آمد کا فوراً نوٹس لیا گیا۔ کاؤبوائے ٹائپ ایک اُدھیڑ عمر کا مرد بھاگتا ہوا آیا۔

''کون ہیں؟ کہاں سے ہیں؟ اور کس لیے آئی ہیں؟ جیسے سوال ایک ہی سانس میں پُوچھے گئے۔ تیوروں میں ذرا سختی سی تھی۔ میں نے بھی جوابی چوٹ کی۔

''پہلے سانس درست کرو۔پاکستان سے ہیں اور پُرامن عورتیں ہیں۔''

پاکستان کا سُن کر تو اس کے منہ کے زاویے بگڑ گئے۔کچھ دیر بیٹھنے اور پروگرام دیکھنے کی درخواست رد ہوئی اور ہمیں فوراً باہر نکل جانے کا کہا گیا۔

بڑبڑاتے ہم باہر تو آ گئے پر جاننے کی ٹوہ اُکسانے لگی کہ معلوم تو ہو۔کون لوگ ہیں؟اگر ترک ہیں تو کتنے بدلحاظ؟برادر ملک کی بے ضرر قسم کی عورتوں سے کیا خطرہ؟

ذرا فاصلے پر چند دکانیں تھیں۔انہی میں سے ایک کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔تعارف کروایا۔مسکراہٹوں کا تبادلہ اور محبت بھرے کلمات ملے۔چلو شکر کچھ دلجوئی ہوئی۔اب ذرا تجسّس کی پٹاری کھولی۔دکاندار کا لہجہ گو نارمل ہی تھا مگر ہلکی سی بیزارگی کا عنصر بھی تھا۔

''یونانی یہودیوں کا میوزک سکول ہے۔سارا دن بس غُل غپاڑہ مچا رہتا ہے۔''

چلو تھوڑی سی ٹھنڈ پڑی اور کچھ معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔

بیگلو Beyoglu کا پرانا نام پیرا تھا۔استنبول کے اِس حصّے میں رہنے والے زیادہ لوگ یونانی عیسائی اور یہودی تھے اور اب بھی ہیں گو یہودیوں کی ایک اکثریت نے اسرائیل بننے کے بعد ہجرت کر لی تھی۔مگر بہت سے لوگوں نے نقل مکانی پسند نہ کی کہ اپنے جمے جمائے کاروباروں کو چھوڑ کر نئی جگہوں پر جا کر سیٹ ہونا انہوں نے مشکل سمجھا۔

رُخصت ہو کر چلنے لگے کہ چلو گلاٹا ٹاور کو دیکھیں۔مگر ٹنل پر پہنچ گئے۔معلوم ہوا تھا یہاں دنیا کا شاید دوسرا مگر قدیم ترین اور مختصر ترین زیرزمین ریلوے ٹریک ہے۔گولڈن ہارن کے شمالی ساحل پر واقع 573 میٹر لمبا جو گلاٹا اور پیرا یا ان کے ماڈرن ناموں کیراکوئے اور بیگلو Beyoglu دو اہم حصّوں یا ضلعوں کو ملاتا ہے۔

یہ ایک فرانسیسی انجنیئر ہنری گیوند Gavand کا کارنامہ ہے جو کہیں 1875

میں استنبول کی سیر کیلئے آیا تھااور جس نے اپنی سیاحت کے دوران اِن دونوں حصّوں کے درمیان سفر کرتے لوگوں کو ہچکولے کھاتے اور ایک دوسرے پر گرتے دیکھا۔دراصل کیرا کوئے یعنی گلاتا سطح سمندر سے جڑا ہوا ایک طرح ہر قسم کی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔بگلیو Beyoglu یعنی پیرا اُونچائی پر ہونے کی وجہ سے رہائش کیلئے زیادہ موزوں سمجھا جاتا تھا۔

اُس نے لوگوں کواس تکلیف سے نجات دینے کا سوچا۔اپنی تجویز کووہ عثمانی خلیفہ سلطان عبدالعزیز کے پاس لے گیا۔جس نے تفصیلات سُن کر پروجیکٹ کی منظوری دی۔ درمیان میں بہت سے مسائل حائل ہوئے۔تاہم ایک نیک نیت منصوبہ تکمیل پر پہنچ کرلوگوں کی سہولت کاباعث بنا۔

دومنٹ کا سفر۔بندے کے سفری شوق کا حلق تالو بھی نہ گیلا ہو اور منزل آجائے۔زیرِزمین اسٹیشن بہت خوبصورت تھے۔آرٹ کے شاہکاروں سے سجے۔

ہم نے بھی بےاختیار سوچا۔بلاشبہ اُس نے پیسہ ضرور کمایا ہوگا۔مگر سوچ اورنیت کیسی خالص تھی۔

استقلال سٹریٹ کو پہلی بار دیکھ کرتو جیسے بھونچکارہ جانے والی بات تھی۔بٹر بٹر تکتے تھے۔دودھیا روشنی دروازوں سے،کھڑکیوں کے شیشوں سے یوں پھوٹ پھوٹ کر باہر لپکتی تھیں کہ جیسے اندر آتش فشاں پھٹ پڑے ہوں۔فضاؤں میں نظریں ڈالنے سے لگتا تھا جیسے ستاروں سے سجا آسمان اپنی قوسِ قزح کے ساتھ استقلال سٹریٹ پر اُتر آیا ہے۔نیلے،پیلے،سبز رنگ جیسے مہتابیاں چھوٹ رہی ہوں۔پھلجڑیاں رقصاں ہوں۔

خوبصورت انسانی چہرے پل بھر کیلئے لشکارے مارتے،عریاں حسن کے نظارے آنکھوں کو پھیلاتے،گرماتے اور پل جھپکنے میں کہیں اوجھل ہوجاتے۔دوحسین چہرے اور

قیامت جیسے جسم کہیں سگریٹ کے مرغولوں میں چکریاں کھاتے کھاتے سامنے آئے اور پھر غائب ہوگئے۔

اب پینڈو آنکھیں ہجوم میں ان کی تلاش میں سرگرداں۔ پھر یہ کوشش کہ کوئی اور ایسا ہی حسین منظر گرفت میں آئے۔ نیون سائن جل بُجھ جل بُجھ میں ہی اُلجھے ہوئے تھے۔ ہجوم روشنیوں میں نہاتا شاہراہ کے سینے پر کسی پھڑکتے دل میں ہلچل مچاتے گیت کی طرح رواں دواں تھا۔

اس سٹریٹ میں ٹرام کا چلنا تو صرف ایک نوسٹلجیائی کیفیت کا ہی آئینہ دار تھا۔ ہر طرح کی سواری تو یہاں ممنوع تھی۔ اس کی اِس خوبی کو تو چلیے جانے دیں کہ یہ ٹنل کی داخلی گزرگاہ کو تقسیم سکوائر سے ملاتی ہے۔ یہ تو استنبول کے شاہکاروں میں سے ایک ہے۔ عثمانی دور سے لے کر آج تک جب انہوں نے اسے مغربی ملکوں کے سفارت خانوں کیلئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کی بلندو بالا خوبصورت عمارات اور اُنکا بانکپن، طرز تعمیر جو انسیویں صدی کے کلاسیکل طرز تعمیر میں آتا ہے۔ اس میں بنے ریسٹورنٹ، ہوٹل، کافی شاپس، دوکانیں، گوتھک سٹائل کا چرچ اور گلاتا سرائے کو دیکھنا کتنا پُر لطف کام تھا۔ سیاحوں اور بالخصوص نوجوانوں نے اِسے ترکی کا دل اور روح یونہی تو نہیں کہا۔ ہماری بیچاری آنکھیں نظارے سمیٹتے سمیٹتے ہی ہلکان ہوگئی تھیں۔

اس کی پستہ کریم جیسے کپوں میں دوکاندار کا لمبے چوبی ڈنڈے سے ڈالنے کا عمل دلچسپ اور اسے کھانا دلچسپ ترین کام۔ گانے گانے اور ساز بجانے والوں کی ترکی کے علاقائی روایتی ملبوسات میں سڑکوں پر مظاہرے کرتی منڈلیاں۔ ترکی قہوہ بیچنے والے بھی ایک خاص کردار۔ لکڑی اور شیشوں سے بنی چار پہیوں والی ریڑھیاں جن میں رنگا رنگ کھانے پینے کی چیزیں، پھولوں، کپڑوں کی جیولری کی دکانیں۔ ہائے کیا کیا نہیں تھا وہاں۔

گلاٹا سرائے سکوائر میں مسلسل دو شامیں گزاریں کہ اس کے حسن سے جی نہیں بھرتا تھا۔ایک بہت خوبصورت ریسٹورنٹ میں جانا چاہا جب سیما نے ڈپٹ کر بٹھا دیا۔

''کمبخت باہر سے دیکھ کر دل ٹھنڈا کر لے۔اندر جا کر بھڑ بھونجوں کی طرح سستی ڈشوں کو کھوج کرو گی تو ننگی ہو جاؤ گی۔یوں بھی یتیمی مسکینی تو تیرے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ہم نے ایک سمط Simitاور صبح کا چوری کیا ہوا بقلاوہ کھا کر دوپہر گزار لی ہے۔رات کو کمبخت مارے بینگن اور اُبلے ہوئے چاول وہ میرا عاشق لے کر بیٹھا ہوگا۔کھائیں گے جا کر۔

بہتیری ٹکریں ماریں کہ Cicek Pasaji میں کسی طرح اندر جا کر نظارے لوٹوں پر اُس نے ایک نہ چلنے دی۔

''ارے آگے ہی ملک بیچارہ بڑا بدنام ہوگیا ہے۔اب اندر جا کر ندیدوں اور جاہلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تیرا دیکھنا پول تو کھول دے گا نا۔تیسری دنیا کے غریب اور دہشت گردی کے مارے ملک کی سیاح۔

''سیما مجھے شدید غصہ آیا۔بتا تجھے کوئی کمپلیکس ہے۔پیسہ جیب میں نہ ہو تو باہر نکلا جاتا ہے کہیں۔''

پر وہ سیما کیا جو میری سنتی۔

تقسیم سکوائر میں 1928 کی یادگار کے پہلو میں بیٹھ کر گرد و پیش کے نظارے لوٹنا بھی خاصا دلچسپ کام تھا۔یادگار کی محرابوں میں پھنسے اتاترک اور اُن کے ساتھیوں کو ہاتھوں میں پکڑے جھنڈے لہراتے دیکھنا اور ارد گرد بکھرے نظاروں کی بارش میں بھیگنا بہت مزے دار تھا۔

ہم نے مسلسل وقفوں سے پانچ دنوں کے ہر روز ڈھائی تین گھنٹے یہاں گزارنے

کامعمول بنالیا تھا۔اس کے اردگرد پھیلے لانوں کے آہنی جنگلوں میں مقید پھولوں اور سبزے کے ڈیزائن دار قطعوں کو دیکھ کر خوش ہوتے پھر ذرا گھومتے پھرتے۔پھولوں سے بھری دوکانوں پر پھول دیکھ کر مسرت بھرا اظہار ہوتا۔ڈونر کباب کا سینڈوچ کھاتے۔کُنجوں میں بدمعاشیاں کرتے جوڑوں کو دیکھ کر انہیں ستانے کو دل مچلتا مگر ڈر جاتے کہ ہائے لوگ کیا کہیں گے۔

بوڑھے منہ مہاشے

کرنے چلے تماشے

جام وسبو کے نظارے بھی ہوش اُڑانے والے ہوتے۔نوخیز بچے بچیاں یوں گٹ گٹ بوتلیں چڑھاتے جیسے کمبخت پانی پی رہے ہوں۔

ایسے ہی دنوں میں شلوار قمیض میں ملبوس خاتون سے ہماری ملاقات ہوئی۔ہماری عمر کی یا ہم سے کچھ چھوٹی۔شوہر کہیں ساٹھ کی دہائی میں یہاں آئے اور بس یہیں کے ہوگئے۔تین بچے تینوں بیٹے جو موسمی پرندوں کی طرح اڑانیں بھرتے رہتے ہیں۔کاروباری سلسلہ چین اور جاپان سے جڑا ہوا ہے۔سنان پاشا کے علاقے میں رہائش تھی۔

لوگوں کے بارے میں میرے ایک سوال کے جواب میں بولیں۔دراصل معاشروں میں اچھے بُرے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔مثالی معاشرے تو کہیں بھی نہیں ہیں۔تاہم ترک بہت ساری خوبیوں کے مالک ہیں۔اتاترک نے جو سبق اس قوم کو پڑھایا کام کرنے،خود پر اعتماد کا اور اپنی قوم پر فخر کا۔وہ ان لوگوں نے اچھی طرح پڑھا اور عمل بھی کیا۔نتیجہ ظاہر ہے۔آج ترکی بہت سارے بحرانوں سے نکل آیا ہے۔قبرص کا مسئلہ بھی انہوں نے حل کرلیا ہے۔''

''ہائے سبق تو ہمیں بھی بڑے اچھے ملے تھے۔یقین،اتحاد اور تنظیم۔ہم جاہل

روز پڑھتے ہیں مگر حرز جان نہیں بناتے ۔ نہ لیڈر ایسے ملے جو چاک اور تختہ سیاہ ہاتھوں میں پکڑ کر اس کا مفہوم سمجھانے گاؤں گاؤں جاتے ۔ ہمارے اندر تو دُکھ ہی دُکھ تھے ۔ خوابوں، خواہشوں کے انبار تھے ۔ وطن کیلئے کیا کریں جیسے جذبوں کے طوفان تھے ۔

دلیر اور جی دار ہیں ۔ اپنی رائے رکھتے ہیں ۔ اور خم ٹھونک کر اس کا اظہار کرتے ہیں ۔ کردار کا یہ پہلو دیکھیں کہ آتا ترک سے گہری محبت اور عقیدت رکھنے کے باوجود اس کے مرنے کے صرف بارہ سال بعد مخالف پارٹی کو میدان میں لا کھڑا کیا ۔

اسلام کے حوالے سے میرے ایک سوال کے جواب میں نفیسہ بیگ نے کہا ۔ اسلام کو وقت اور دنیا کے بدلتے رجحانات میں ترکی کے اسلامی مفکروں نے اسے جس عمدگی اور خوبصورتی سے اپنے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے وہ قابل تقلید ہے ۔ سعید نورسی ہوں یا فتح اللہ گلین ہوں ان کی تحریکیں ریفارمسٹ تحریکیں ہیں جنہوں نے سوچ کو تبدیل کیا ۔ اُسے وسعت دی ۔ اسلام کے آفاقی پیغام کو اِسی روشنی میں آگے بڑھایا کہ معاشرے برداشت اور رواداری سے نمو پاتے اور پھلتے پھولتے ہیں ۔ تنگ نظری اور تشدد گھن کھائی لکڑی کی طرح ریاست کی جڑیں کھوکھلی کر دیتا ہے ۔

میں سماجی حوالوں سے بھی کچھ باتیں جاننا چاہ رہی تھی ۔ ہم زبان ملی اور وہ بھی ایک عرصے سے اِس ماحول میں رچی بسی ہوئی تو بہت کچھ جاننے کی تمنا ہونٹوں پر آنے لگی ۔ اتنا تو ہم جان ہی چکے تھے کہ ترکی میں والدین کا بہت احترام اور خاندانی نظام بھی خاصا مظبوط ہے ۔ تعطیلات پر اکٹھے ہونا اور تہوار منانا بہت پسندیدہ ہے ۔ ہاں البتہ عورت کِس حد تک اپنے معاملات میں آزاد ہے ۔ اس کا کچھ اندازہ تو ہوتا تھا کہ وہ ہر شعبے میں سرگرمی سے کام کرتی نظر آتی ہے اور پُر اعتماد بھی بہت ہے ۔

تاہم نفیسہ بیگ سے جو کچھ سُننے کو ملا وہ خاصا حیرت انگیز تھا ۔

استنبول اور انقرہ میں جو کچھ نظر آتا ہے یہ ترکی کا بڑا روشن چہرہ پیش کرتا ہے۔ رواداری سے بھرا ہوا سیکولر معاشرے کا چہرہ۔ جہاں معاشرتی رویوں اور قانون کے لحاظ سے عورت کو زندگی کے ہر شعبے میں برابری کا درجہ حاصل ہے۔ مگر جونہی آپ دیہاتی علاقوں خصوصاً جنوب مشرق کی طرف نکلتے ہیں۔ آپ کو بہت واضح فرق نظر آئیں گے۔ یہاں سماجی اور معاشرتی حوالوں سے عورت کو وہ حقوق حاصل نہیں۔ عزت کی خاطر قتل بھی ہوتے ہیں۔ پسند کے اظہار پر لڑکی کو زدوکوب بھی کیا جاتا ہے۔ جلانے، گولی سے مارنے اور چھرا گھونپنے کے واقعات بھی ہوتے ہیں۔ مزے کی بات کہ ایسا کرنے والوں کو قانون اگر گرفت میں لے کر جیل بھیج دیتا ہے تو وہاں انہیں بہت عزت واحترام ملتا ہے۔

ہم تو بڑے حیران ہوئے۔ بے اختیار ہی منہ سے نکلا تھا۔

''یہ مسلمان کچھ زیادہ ہی عزت کے معاملے میں حساس نہیں ہیں۔ جس مسلمان ملک کو اٹھا کر دیکھ لیں وہی اسی میں کوڈے کوڈے دھنسا نظر آئے گا۔

نفیسہ بیگ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

یوں قتل تو عورت یورپ میں بھی ہوتی ہے۔ کہیں شوہر اور کہیں دوست کے ہاتھوں۔ بس یہ عزت اور غیرت کے مفروضے ہم مسلمانوں کے ساتھ کچھ زیادہ چمٹ گئے ہیں۔ دراصل ہم لوگ اسلام کی روح سے ناآشنا ہیں۔ عزت کی خاطر قتل کا اسلام سے کب کوئی تعلق ہے؟ یہ تو ہمارے معاشرے کی جہالتوں کے نمونے ہیں۔ مسلمانوں کے بانی پیغمبر کو اسلام کی خاتون اول پسند کرتی ہے اور بذات خود شادی کا پیغام دیتی ہے۔ اِس سے بڑی روشن خیالی اور لبرل ازم کی مثال بھی کوئی ہو سکتی ہے۔

نفیسہ بیگ اب رخصت ہونا چاہتی تھی۔ بڑی محبت سے انہوں نے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ پاکستانی کھانے کھلانے کی پیشکش کی۔

''چلیے کوشش کریں گے۔''ہم نے اُنکا شکریہ ادا کیا۔

بُھوک لگ رہی تھی۔ڈونر کباب کھانے کا ہی فیصلہ ہوا۔پھر سیما کراکری کی ایک شاندار سی دُکان میں گھس گئی۔کرسٹل اور برقی روشنیوں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔وہ ایک کافی سیٹ کو دیکھنے لگی جب ایک دلکش سا مرد اُس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔کہاں سے ہیں؟ سوال ہوا۔سیما نے پاکستان کا کہتے ہوئے متلاشی نگاہیں اِدھر اُدھر کسی اور خوبصورت چیز کی تلاش میں دوڑائیں۔

''آپ کا پرفیوم بہت اچھا ہے۔کونسا ہے؟''

سیما کے ساتھ ساتھ اب میرے بھی چونکنے کی باری تھی۔اُسنے فوراً ڈپیٹ کر کہا۔''آپ کو میرے پرفیوم سے کیا لینا۔فضول باتیں مت کریں۔''

''کمال ہے۔آپ کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں؟ناک کا تو جواب نہیں۔چہرہ کیسا دلکش ہے؟ شادی کرلیں مجھ سے۔میں اِس دکان کا اکیلا وارث ہوں۔گھر بھی بہت بڑا ہے میرا۔''

میری ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

''لو بھئی ترکی میں تیرے عاشقوں کی قطاریں لگ گئی ہیں۔''

مزے کی بات اِس بار سیما نے جھنجھلانے یا جزبز ہونے کی بجائے اِس صورت کو دلچسپی سے دیکھا اور لُطف اٹھایا۔پر بات تو یہ ہے۔اُسنے گفتگو میں بڑا ڈرامائی سا تاثر پیدا کیا۔

''میں تو چھ بچوں کی ماں ہوں۔پانچ لڑکیاں اور ایک لڑکا۔''

''تمہاری جس لڑکی کی شکل وصورت تم جیسی ہو۔اُس کی میرے ساتھ شادی کردو۔دکان اور گھر اُسکے نام لکھ دوں گا۔''

سیماب کھلکھلا کر ہنسی۔ دونوں ہاتھ لہراتے ہوئے نفی کا تاثر دیا اور بولی۔

''مجھے کیا پتہ تھا کہ دور دیس کا کوئی دل پھینک شہزادہ اُنکا منتظر ہے۔نہیں تو کوئی ایک آدھ تنگ خالی رکھ ہی لیتی۔اب تو ہاؤس فل ہے۔''

اُسے ہنستے اور مسخرے پن سے ہاتھ ملتے دیکھ کر ہم نے دکان سے باہر نکل کر اس ڈرامے کو وہیں وائنڈ اپ کر دیا۔

باب نمبر:۱۵ دولماباشی پیلس

۱۔ دولماباشی Dolmabahce محل بے جا اسراف اور فضول نمود و نمائش کا اظہار ہے۔

۲۔ کاش کہیں یونیورسٹیاں بنائی جاتیں۔

۳۔ بیگم آف بھوپال نے اپنے سفرنامے میں اس محل اور مکینوں کا ذکر بڑے معصومانہ اور خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

''اف دولماباشی Dolmabahce محل کیا خوبصورت اور کس قدر رشاندار ہے۔''

سیما بستر پر لیٹی اپنی جانب کا ٹیبل لیمپ جلائے بروشرز اور کتابوں میں سے تصویریں دیکھتی اور نہال ہو ہو جاتی تھی۔

کب چلنا ہے؟ اگلے دن کوئی پانچ سات بار تو ضرور ہی پوچھا گیا۔میرا تو کچھ اتنا دل نہ تھا۔توپ کپی دیکھ لیا تھا۔شاہوں کی شان وشوکت کے پٹارے۔مگر دیکھنا ضروری تھا کہ استنبول کی خاص چیز تھی۔سورات کو اگلے دن کے پروگرام میں دولماباشی کی سیر شامل کی۔

ناشتے میں ٹھونس ٹھونس کر کھانا اور دو ٹکیاں حلوے اور کبھی بقلاوے کی ٹشو پیپر میں لپیٹ کر پرس میں رکھنا ہمارا معمول تھا۔

ابھی ہم صبح سویرے ہی نکل پڑے تھے۔محل سے پہلے دولماباشی مسجد آئی۔اُسے تو باہر سے ہی سراہا۔راستہ دورویہ چناروں کے درختوں سے سجا ہوا تھا محل کی حدود میں داخل ہوئے۔خدا جھوٹ نہ بلوائے اتنی لمبی لائن ٹکٹ کیلئے نظر آئی تھی کہ میں نے اضطراری کیفیت میں سر پر ہاتھ رکھ لیے۔

''لگتا تو یوں ہے جیسے ساری دنیا اِسے ہی دیکھنے آگئی ہے۔ سیما پیروز میں تو چلی۔ کہیں بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کروں گی۔ ٹکٹ کیلئے تمہیں ہی لائن میں لگنا ہے۔ مل گیا تو آواز دے لینا۔''

بجری بچھے زمینی ٹکڑوں پر چلتی میں ایک چھوٹے سے درخت تلے بیٹھ گئی۔ سنہری دھوپ میں سکون سے بہتے باسفورس کو دیکھنا کتنا خوبصورت کام تھا۔ مجھے آج صبح کا پڑھا ہوا یاد آیا تھا کہ یہ علاقہ بنیادی طور پر ابتدائی عثمانیہ دور میں نیوی کی بندرگاہ کے طور پر استعمال ہوا۔ سترھویں صدی کے آغاز میں سلطان احمد اول کے محل بازیوں کے شوق نے اس کی لکڑیوں سے بھرائی کروا کے یہاں بشکتاش Besiktas محل بنا دیا۔ مگر کثیر سرمائے سے بنا محل ایک خوفناک قسم کی آگ نے جلا کر خاکستر کر دیا۔ پھر اکتیسویں سلطان عبدالمجید اول جن کا دورِ حکومت 1839 سے 1861 تک تھا نے یہیں ایک شاندار محل بنانے کا ارادہ کیا کہ یہ سمندر کے کنارے ہونے کے ساتھ شہر کی مرکزی جگہوں سے بھی قریب ترین تھا۔

سچ تو یہ ہے سلطان کے دل میں کہیں پیرس کے "لوور Louvre" محل جیسی چیز بھی استنبول میں ہونی چاہیے کی امنگ تھی۔ لندن کا بکنگھم پیلس بھی ذہن میں تھا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ اِسے زیادہ سے زیادہ یورپی انداز میں بنانے کی کوشش ہوئی۔ آرمینیائی ماہرِ تعمیرات کارابت بلیان Karabet Balyan کو مقرر کیا گیا۔ محل کی وجہ سے یہ آہستہ آہستہ رہائشی کالونی بن گئی۔

دفعتاً مجھے پانی میں تیرتے سنگِ مرمر کے زینے نظر آئے۔ سامنے پورا گھاٹ تھا۔ سیڑھیاں لمبی قطار میں نیچے اُتر رہی تھیں۔

''اچھا تو اسی گھاٹ سے شاہی بجروں میں شہزادیاں بیٹھ کر کبھی سمندر خوری اور کبھی پار ایشیا کے محلوں میں رہنے والے اپنے رشتے داروں کے ہاں جاتی ہونگی۔ کیا زندگی تھی اُن

کی بھی ۔ مجھے شہزادی دُرِّشہوار یاد آئی تھی ۔ آخری سلطان عبدالمجید آفندی کی بیٹی جس کے حُسن کے قصیدوں سے کتابوں کے صفحات کالے ہوئے پڑے ہیں ۔ جو حیدر آباد دکن کے نواب خاندان کی بہو بنی تھی ۔

میں نے اپنے عقب میں دیکھا تھا مجھے اپنے نام کی پکار سنائی دی تھی ۔ سیما بھاگی چلی آتی تھی ۔ لتاڑتی، کوستی اور یہ بتاتی کہ میں ہاتھوں میں ٹکٹ لے کر تمہیں ڈھونڈنے نکلی ہوں ۔ اندر داخلہ گروپوں کی صورت میں ہوگا۔"

تیز دوڑ لگانی پڑی ۔ بیر بہوٹی جیسے سرخ، کاسنی اور پیلے پھولوں کے تختوں سے سجے لانوں اور اُن میں دھرے مجسموں پر طائرانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے ۔ پتہ چلا کہ لسانی تقسیم پر گروپ بنائے جا رہے ہیں ۔ پردان زبانیں تو وہی انگریزی، فرانسیسی، جرمن، ترکی اور عربی تھیں ۔ ہم بیچارے اُردو فارسی والے کس گنتی شمار میں؟

سچی بات ہے ابھی تو محل کا بیرونی منظر ہی سامنے تھا جو اپنی خوبصورتی، اپنی دلآویزی، اپنی تعمیراتی ساخت اور آرائش کے اعتبار سے بے مثل تھا ۔ اس کا کلاک ٹاور، مرکزی دروازے کی تعمیری زیبائش اور سب سے بڑھ کر پتھر کی طرح بے حس و حرکت کھڑا دربان ۔ ہمیں تو لگا جیسے کوئی مومی مجسمہ نصب ہو ۔ مگر معلوم ہوا تھا کہ جیتا جاگتا گوشت پوست کا انسان ہے ۔ یہ شو آف، یہ اظہار یہ عین ممکن ہے ماضی کی کسی تہذیبی روایت کا اعادہ ہو جسے سیاحوں کو دکھانا اور انہیں مرغوب کرنا مقصود ہو ۔ مگر مجھے تو انتہائی ظالمانہ لگا ۔ ماسکو میں بھی ریڈ سکوائر میں میں نے ایسا دیکھا اور افسوس کیا تھا ۔

تاہم میں نے افسوس اور ملال پر لعنت بھیجی اور دلربائی سے بوجھل ماحول پر نگاہیں جمائیں ۔ ہرے بھرے سرسبز لان، پھولوں سے بھرے قطعے، چمکتی دھوپ، نیلا کچور آسمان اور سیاحوں کی قوس و قزح ۔ ہائے کیسا بھریا میلہ ہے ۔ ہائے ایسے میلے میرے ملک میں کب

سمجھیں گے؟

اندر داخل ہوکر جلد ہی ہم انگریزی دان ٹولے سے الگ ہوگئے۔ایک خوبصورت عمارت کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہم نے وہ نقشے کھولے جو دیئے گئے تھے جن کے مطابق محل تین حصّوں پر مشتمل تھا۔سلامیک selamlik یعنی مردانہ انتظامی حصّہ۔درمیان میں گرینڈ یا تقریباتی ہال اور دائیں ہاتھ حرم تھا۔

معلوم ہوا تھا کہ جس عظیم الشان عمارت کے پوڈوں پر بیٹھے ہیں اور سامنے سرسبز لانوں کو دیکھتے اور اُن میں اُگے بوٹوں پر کھلے سرخ اور بنفشی پھولوں کو تکتے ہیں دراصل سلامیک ہی ہے۔ہم نے حرم دیکھنے کو ترجیح دی کہ توپ کپی کا بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔

حرم کی عورتوں کے سیر سپاٹوں کیلئے بگھیوں اور گاڑیوں پر ایک نگاہ بے اعتنائی ڈالتے ہم آگے بڑھنے لگے۔مادر ملکہ اور شاہی خواتین کے کمروں کی بہتات پاگل کرنے والی تھی۔نیلے،سبز،سرخ کمرے قیمتی فانوسوں سے جگمگاتے،نقش ونگاری سے مزّین چھتیں، منفرد ساخت کے آتش دان،سنگ مرمر کے فرش،بلوریں آبشاریں،چمکیلے کپڑوں کے پردے،صوفوں اور کرسیوں کے طلائی بازو۔قیمتی اور شاندار دستی قالین جن کے رنگوں کے دلکش امتزاج اور ماہرانہ بنت توجہ کو فوراً کھینچتی تھی۔میرے پروردگار نمود نمائش کا ایک جہان تھا یہاں۔

تو بھا ابھی چند کمرے ہی دیکھے تھے کہ تھکنے لگے۔اُف یہاں تو سینکڑوں کی بات تھی ایک دوسرے میں گھسے ہوئے اندر ہی اندر پھیلتے چلے جاتے تھے۔

مارو گولی۔ایک کمپاونڈ میں اترتی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پرس سے حلوے کی ٹکیاں نکالیں۔Nuts نکالے۔کھائے۔تھوڑا آرام کیا اور سکینڈ فلور کو فتح کرنے چلے۔دولت کی اتنی بے جا اور فضول نمائش سے کوفت کا احساس رگ و پے میں اترتا تھا۔ہم نے چند

مزید کمرے دیکھے۔ان کی دیواروں کی پینٹنگز نے کہیں رکنے پر مجبور کیا۔کہیں آگے بڑھ جانے کا کہا۔

تاہم وہاں تو دیر تک رکنا پڑا تھا جہاں سلطان محمد فاتح کے بحری بیڑے باسفورس میں داخل ہوتے تھے۔تاریخی لمحے قید ہوگئے تھے۔خوبصورت رنگوں اور ہنر مندوں کے کمال فن کو چھوتے شاہکار۔

ہمارے لیے سب سے دلچسپ حصّہ وہ تھا اور اُسے ہم نے دیکھا بھی توجہ اور محبت سے۔اتاترک کمال پاشا نے اپنے آخری ایام اِس محل میں گزارے تھے۔اُن کے ڈاکٹروں نے انہیں یہاں رہنے پر مجبور کیا تھا۔اُن کا سٹڈی روم بلیو ہال سے ملحق تھا۔یہ سلطانوں کا بھی سٹڈی روم ہی تھا۔خاصا کشادہ اور سجاوٹ میں بھی باذوق۔

جس کمرے میں وفات ہوئی وہ سٹڈی روم کے ساتھ تھا۔اس بیڈ پر ابھی بھی وہ ریشمی کور تھا جس پر ترکی جھنڈے کی طلائی ونقری دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی ہے۔عثمانی دور میں یہ سلطان کی خوابگاہ تھی۔کمرے کی کھڑکیوں سے باسفورس کی نیلاہٹیں اور افقی کناروں سے پرے ایشیا کے ساحلوں پر بستے اسکدار کے مدھم مدھم نقش ماحول کو کتنا حسین بنارہے تھے۔اس سے بالکل جڑا ہوا پنک ہال تھا۔یہی وہ ہال تھا جہاں سلطان کی والدہ اپنے خاص الخاص مہمانوں کوشرف ملاقات بخشتی تھیں۔یہ کمرہ اتاترک کے زیر استعمال بھی رہا۔آرائش و زیبائش تو چھوڑیئے جو اِس کمرے کی تھی کہ وہ تو ہر جگہ آنکھیں پھاڑتی تھی۔یہاں بہت قیمتی چیز جو دیکھنے کو ملی وہ شہزادی دُرِّشہوار کا پوٹریٹ تھا۔آخری عثمانی سلطان عبدالمجید آفندی کی حسین ترین بیٹی۔کتنی دیر وہاں کھڑے اسے دیکھتے رہے۔فرانسیسی آرٹسٹ کے شاہکار نے توجہ کھینچی اور اُسے بھی دیکھا جس پر چارلس چپلن کے دستخط تھے۔پر دُرِّشہوار کا پوٹریٹ واپسی کیلئے بڑھتے قدموں کو روک کر اپنے پاس کھینچ لاتا تھا۔ہائے کیا چیز

تھی یہ۔سب کمرے ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

اور اب تھک گئے تھے۔

تقریباتی ہال میں گھسنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔کوئی بیس بائیس کمرے اور ساتھ میں اُتنی ہی لمبی بالکونیاں اور اُن میں رکھے جھمیلے سبھوں نے مار پٹڑہ کر دیا تھا۔مگر خلقت تھی کہ یہاں اُمنڈی پڑ رہی تھی۔

ہم نے پہلے تو بیٹھ کر بچا کچھا بقلاوہ کھایا پھر ہال کو سرسری سا دیکھا۔ گائیڈ شینڈلیرز کے بارے اپنے سامعین کو بتا تا تھا کہ یہ ملکہ وکٹوریہ دوم کی جانب سے بھیجا گیا تحفہ ہے۔اب جو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔کیا چیز تھی بھئی۔وہ جو کہتے ہیں تو بھئی بڑا سچ ہے۔خانان دے خان پروہنے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور یاد نے چٹکی لی۔بہت پہلے کا پڑھا ہوا ایک بڑا منفرد سا سفرنامہ یاد آیا تھا۔شہزادی میمونہ سلطان کا لکھا ہوا جنہوں نے اپنی ہونے والی ساس سلطان جہاں بیگم والئی بھوپال کے ساتھ یورپ سے واپسی پر استنبول میں پڑاؤ کیا اور اسی محل کے اسی کمرے میں سلطان عبدالحمید دوم کے ساتھ ان کی ملاقات اور پھر حرم کے انہی کمروں میں بیگم بھوپال کی سلطانہ یعنی سلطان عبدالحمید دوم کی اہلیہ سلطانہ سے ملاقات کا احوال لکھا۔

وہ بھی کیسا منظر ہوگا۔میں نے اپنی یادداشتوں کو ٹٹولا جب برقعے میں ملبوس بیگم بھوپال چہرے کو نقاب سے ڈھانپے ترکی سلطان کے ہمراہ انکی اہلیہ سلطانہ ناز یکدہ آفندی سے ملنے جارہی تھیں۔لمبی لمبی گیلریاں جن میں کھڑے خواجہ سراؤں کی قطاروں کو دیکھتے اور پھر زنانہ حصّے میں خاص الخاص خدّام کی معیت میں حرمیلک میں داخل ہونے کا منظر۔

سلطانہ کی آمد اور سلطان کا بیگم بھوپال کا ان کے حوالے کرتے ہوئے رخصت ہونا۔نقاب کا اُلٹنا اور گرمجوشی سے بھرا معانقہ۔بیگم بھوپال کا انگریزی بولنا اور سکریٹریوں کا

ترجمانی کے فرائض سرانجام دینا۔ دولما باشی محل کی سیر اور اس کا احوال ۔اسے جس معصومانہ خوبصورتی سے لکھا گیا ہے۔اُسکا لطف اور مزے کا صرف پڑھنے سے تعلق تھا۔

باہر نکلنے سے قبل ہم نے اس پر بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا تھا۔یہ برف جیسا سفید چمکتا دمکتا، آنکھوں کو خیرہ کرتا جس کی پور پور میں عثمانیہ روایتی آرٹ، بارون اور مغربی سٹائل گھلا ہوا ہے۔دراصل تو لندن کے بکنگھم پیلس اور فرانس کے Louvre پیلس کی نقل میں بنا۔

''ہائے پروردگار یونیورسٹیاں نہ بنائیں۔کیمرج اور آکسفورڈ سامنے تو تھیں۔نقل ہی کرنا تھیں تو ان کی کرتے۔بھلا قوم کو اس طرح تعلیم یافتہ نہ بنایا جیسا کہ وقت کا تقاضا تھا۔

تو یہ اکتیسویں سلطان عبدالمجید نے 1856- 1843 تیرہ سال کے لمبے عرصے میں بے حد کثیر سرمائے سے بنوایا اور آخری سلاطین تک خزانہ خالی تھا۔معاشی حالت ابتر تھی۔ایسے میں مغربی اقوام کے دانت تیز نہ ہوتے تو اور کیا ہوتا۔کمزور کو کون جینے دیتا ہے۔

دکھ اور کرب کی بڑی لمبی آہ میرے اندر سے نکلی تھی۔رعب دوب اور دبدبے والی ایک عظیم سلطنت کیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔

باب نمبر:۱۶ شہزادوں کے جزیرے

۱۔ سر کیچی ریلوے اسٹیشن کے چہرے کا ایک ایک نقش اپنے قدامتی تعلق کا آئینہ دار ہے۔

۲ شہزادوں کے جزیرے خدائی عنایت اور انسانی ہاتھوں کے خوبصورت شاہکار ہیں۔

۳۔ ترکی کا کوئی سربراہ کتنا بھی مذہبی کیوں نہ ہو اتاترک کے قائم کردہ سیکولر نظام کی حمایت پر مجبور ہے۔

ہوٹل کے ریسپشن پر بولتی آنکھوں اور مسکراتے چہرے والی دلربا سی لڑکی گذشتہ کئی روز سے شام ڈھلے ہمارے اندر داخل ہونے پر اپنے گداز ہونٹوں کو وا کرتے اور موتیوں جیسے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہماری دن بھر کی روداد پوچھا کرتی۔ایسی ہی ایک شام اُس نے کہا تھا۔

''ایڈلر Adalar دیکھا۔''

ایڈلر میں نے حیرت سے آنکھیں اس کے چہرے پر چپکا دیں۔

''میں تو یہ نام پہلی مرتبہ سُن رہی ہوں ۔یہ کیا ہے؟''

''ارے پرنسز آئی لینڈ کہہ لیں ۔کرمسن crimson آئی لینڈ کہہ لیں ۔یہ تو استنبول کے ہیرے ہیں ۔انہیں نہیں دیکھیں گی۔''

اُس نے یوں گڈے باندھے،خوبصورتیوں کے وہ افسانے سنائے کہ وہیں

کھڑے کھڑے فیصلہ ہوا کہ کل ایڈلر چلنا ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر جب جانے کیلئے باہر نکلے۔سیما نے پہلے ریلوے اسٹیشن کیلئے کہا۔"قونیہ چلنا ہے۔"مولانا روم کے مزار پر حاضری دینے کی تمنا میں تو خیر ہم دونوں ہی مری جاتی تھیں۔گذشتہ دو تین دنوں سے ہمارے درمیان ریلوے اسٹیشن جا کر پتہ کرنے اور سیٹ ریزرو کروانے پر بات ہوتی تھی۔پر استنبول اتنا بھرا ہوا تھا کہ سارا سارا دن گُل کرکے بھی ہم اس کی ایک دو چیزوں کو ہی دیکھ پاتے۔

شومئی قسمت کسی راہ چلتے سے پُوچھ بیٹھے۔اللہ جانے اُسے سمجھ نہیں آئی یا وہ تھا ہی بونگا۔گلاٹا کی طرف دھکیل دیا۔ہر روز نقشوں پر مغز پچی نے سرکیجی ریلوے اسٹیشن سے پڑھائی کی حد تک تھوڑی سی واقفیت تو ضرور کروادی تھی۔سوچا کہ شاید معلوماتی اور ریزرویشن آفس وہاں ہو جیسے میرے لاہور میں ہے۔

اب گلاٹا ٹاور پہنچ گئے۔چاکلیٹ رنگے جن جیسی قدو قامت والے مینار کے پاس ہی دنیا کا دوسرا مختصرترین زیرِ زمین ریلوے ٹریک ہے۔جو گلاٹا اور پیرا جنکے نئے نام کیراکوئے Karakoy اور بیگلو Beyoglu ہیں۔اِن دو حصّوں یا ضلعوں کو ملاتا ہے۔

اب جب اُس وسیع و عریض دنیا میں ہونقوں کی طرح گم اُسے دیکھتے، سوچتے اور ایک دوسرے سے کہتے تھے ''بھئی نری بونگی زنانیاں ہیں ہم بھی۔''

اُف اِس کی گھمن گھیریاں تو پاگل کرنے والی ہیں۔چلو کسی سے پھر پوچھتے ہیں۔ایک معقول سے بندے کو پکڑا۔اُس نے سنتے ہی کہا۔

''یہاں کیا کر رہی ہیں؟ سرکیجی جائیں۔'' وہ تو وہیں ایمی نونو کے پاس ہی تھا۔

مڑ کھوتی بوڑ تھلے والا معاملہ تھا۔

سر کیہ جی کے ریلوے اسٹیشن کی عمارت کوئی شاندار سی شاندار تھی۔توپ کپی محل کی دیواروں کی بنیادوں سے سانجھ کا رشتہ جوڑنے والا یہ ریلوے سٹیشن جس پر شاہانہ سفر کے حوالے سے دنیا کی مشہور زمانہ اورینٹ ایکسپریس ٹرین چلتی تھی۔اورینٹ ایکسپریس بھی زمانوں تک کہہ لیجیے کم وبیش ایک صدی تک افسانوی سی اہمیت کی حامل رہی ہے۔بے شمار فلموں میں جلوہ گر ہوئی، ڈھیروں ڈھیر کتابوں میں موضوع سخن رہی۔دولت مندوں نے اس میں سفر کر کے اپنی انا کی تسکین کی۔ماٹھے غریب غربا کیلئے یہ ایک حسرت رہی۔تا آنکہ اسکے مقابلے پر کوئین الزبتھ اور کونکورڈ Concorde میدان میں اُتریں۔1982 میں امریکی تاجروں نے اسمیں بہت سی تبدیلیاں کیں مگر اس کا وہ ماضی اسے نہ لوٹا سکے۔

سچی بات ہے سٹیشن بھی اُس کے شایان شان تھا۔نصف دائرے میں پھیلی عہد ساز سی بلڈنگ جو کہیں 1891 کی پیدائش تھی۔چہرے کا ایک ایک نقش اپنی قدامتی تعلق کا پتہ دیتا تھا۔تاہم جدید میک اپ کے غازے کی لیپا پوتی بڑے دل آویز انداز میں بصارتوں پر بجلیاں سی گراتی تھی۔بلند وبالا چھتوں والے ہال اور ادھر جاؤ اُدھر جاؤ والے سلسلے۔گاڑیوں کے دن اور رات کے اوقات ضرور پتہ چلے مگر یہ جانا کہ انقرہ سے آگے قونیہ جانا بسوں سے بہتر رہے گا۔اور ہاں ٹکٹ اور ریزرویشن حیدر پاشا سے ہوگی جو استنبول کے ایشیائی حصے میں ہے۔

ہم گھڑیاں اور وقت دیکھنے کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔مگر اتفاقاً نظر پڑ گئی اور گیارہ کے ہندسوں کو چھوتی سوئیوں نے جیسے چوکنا کر دیا تھا۔میں سیما کا ہاتھ پکڑ کر اُسے کھینچتے ہوئے باہر لے آئی۔

''سنو یہ مولانا رومی سے ہماری محبت کا امتحان ہے۔اگر یہ سچی ہوئی تو ملاقات کا

اہتمام ہوجائے گا اور اگر اس میں کھوٹ ہوا تو ناتی دھوتی رہ گئی ۔تے اُتے مکھی بہہ گئی والی بات ہوگی ۔چلو جس کا قصد کر کے چلے ہیں پہلے اُسےتو دیکھ آئیں۔''

اب ایک بار پھر انہی پرانے شناسا سے منظروں سے آنکھیں لڑاتے تھے۔

ایمی نونو سے لے کرگلاتا تک کے پانیوں پر چھوٹے بڑے جہازوں ،سٹیمروں، لانچوں، فیری کشتیوں، فیری کروزوں، اوران کے بکنگ آفسز قہوہ خانوں، دوکانوں اور لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو کہیں ترتیب اور کہیں بے ترتیبی سے بکھرا ہوا ہے۔سلطان احمد فاتح پل بننے سے قبل دونوں حصّوں کے درمیان رابطے کا اہم ذریعہ فیری بوٹ اور کشتیاں ہی تھے۔

مختلف کمپنیوں کے نام پڑھتے تھے ۔ایمی نونوسی بس سروس ہے۔صرف کیڈی کوئے Kadikoy تک جاتی ہے۔ذرا آگے ایک سروس اسکدار کیلئے تھی ۔اسکدار اور کیڈی کوئے دونوں کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ ایشیا کے شمال اور جنوب کے علاقے ہیں ۔حیرم Herem فیری سروس ایڈلر جاتی تھی۔ ہمارا ارادہ تو ایک جزیرے پرنہیں سبھوں پرتھوڑی تھوڑی دیر کیلئے اترنے اور نظارے لوٹنے کا تھا کہ رات بر شروں نے قلب و ذہن پر قیامت ڈھادی تھی۔ایک سے بڑھ کر ایک حسین جگہیں۔

یہاں ہمارا اناڑی پن پھر دغا گیا۔ منچلے سے ایک آدمی نے کہا بشکتاش Besiktas چلی جایئے۔وہاں تو بہت بڑی گودی ہے۔افسوس کہ ہماری وہاں مناسب رہنمائی نہ ہوئی کہ وہیں کسی لانچ سے بشکتاش تک جایا جاسکتا تھا۔اب بس میں سوار ہونے کے مراحل سے گزرے۔کھڑکی کے ساتھ سیٹ نہ ملنے کا قلق تھا۔مگر چلو کچھ تو آنکھیں لڑتی ہی رہیں۔باسفورس کے کنارے پر دولماباشی کی جھلک ہی دکھائی دی۔

بشکتاش کی بحری جہازی دنیا نے تو باسفورس کو قابو کیا ہوا تھا۔یوں بھی بشکتاش

باسفورس کے کناروں پر آباد ہونے والی پہلی آبادی ہے۔ ترکی کے امراء اور ایلیٹ کلاس کے گھر اس کے کناروں پر اس کی خوبصورتیوں میں گونا گوں اضافے کا موجب ہیں۔

یہاں تو ایک جہان تھا۔ پاؤں تلے کی دھرتی زلزلے کی مانند ہلتی، ڈولتی، تھرکتی، مچلتی، لہراتی بل کھاتی تھی۔ مجھے کچھ یاد آیا تھا۔ اپنا پورے کا پاکستان اور بوڑھی گنگا کا گھاٹ۔ مگر کتنا فرق تھا۔ وہی جو ماڈرن جوانی اور غریب کی جوانی میں ہوتا ہے۔ یوں درمیان میں پینتیس سال کا وقت بھی تھا۔ ہوسکتا ہے بوڑھی گنگا کا گھاٹ اب اپنا حال حلیہ کافی بدل چکا ہو۔ مگر کتنا؟ تیسری دنیا کے حکمرانوں کو پہلے اپنی جیبوں کی بھرائی کرنی ہوتی ہے پھر کہیں عوام کی باری آتی ہے۔ خیر چھوڑتی ہوں ان لایعنی باتوں کو۔ تو یہاں سب کچھ دیکھنے میں مزہ آرہا تھا۔

فیری کروز میں داخل ہوئے تو فوراً عرشے پر چلے آئے۔ چیختی، چنگاڑتی، شور مچاتی ایک دنیا سامنے تھی۔ سیٹیوں، سائرنوں کی تیز آوازوں، کہیں روانگی اور کہیں آمد کے منظر، لوگوں کے ہجوم، گھاٹ کے نزدیکی پانیوں کا گدلا پن، ماہی گیروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں اُچھل کود بھی نظر آتی تھی۔ مچھلیوں کی کوئی بہتات سی بہتات تھی۔ دو بحری جہاز لنگر انداز ہو رہے تھے۔ ایک بابا کارمچی ہوئی تھی۔ یہیں ہم اُس جاپانی خاتون اور اُس کی پیاری سی گل رنگ بیٹی سے ملے۔ دہلی کے جاپانی سفارت خانے میں شوہر اپنا تاشی کا منصب دار۔ گھر جاتے ہوئے استنبول دیکھنے کا شوق اُسے کھینچ لایا تھا۔

بھانت بھانت کے لوگ اور بھانت بھانت کی بولیاں سماعتوں اور بصارتوں پر حملہ آور تھیں۔ روانگی کا منظر دل موہ لینے والا۔ اب جوں جوں سمندر کے اندر اُتر رہے تھے۔ اس کا جمالیاتی حسن اور مسحور کیسے دے رہا تھا۔ نیلے آسمان تلے، نیلے پانیوں میں متحرک، سامنے ایشیائی حصے کی عمارتوں اور سبزے کا حسن۔

دو لکھنے والے اگر کسی سفر پر اکٹھے ہوں اور ہوں بھی دو عورتیں تو بڑی مصیبت پڑ جاتی ہے۔کسی چیز کو نوٹ کرنے کیلئے کاپی کیا کھلتی ۔سیما کی نوٹ بک بھی فوراً کھل جاتی ۔یوں ایک مسابقاتی سی فضا جنم لے لیتی ۔بہر حال میرے ساتھ ایک ٹرک بیٹھا تھا۔ اخبار کے مطالعہ میں محو تھا۔میں نے متوجہ کیا۔خیر توجہ تو فوراً کی مگر آنکھوں میں رکھائی اور سرد مہری کی ہلکی سی تہہ نے مجھے ٹھنڈا کر دیا۔یوں بھی انگریزی سے بالکل پیدل تھا۔

مگر یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ دلکش اور ادھیڑ عمر کی عورت ملاحت سے ٹکراؤ ہوا۔آبائی تعلق تو کرس Kars سے تھا۔میرے پوچھنے پر بتایا گیا کہ آرمینیا سے ملتی سرحد کا شہر ہے۔چار بچے دو بیٹے ،دو بیٹیاں ۔ایک بیٹا بیٹی لندن اور ایک یہاں استنبول میں۔استنبول کے یورپی حصے کے ضلع فیری کوئے میں بیٹے کے پاس گذشتہ کوئی ہفتہ بھر سے تھی ۔آج ایشیائی حصے میں مقیم بیٹی کے پاس جارہی تھی۔لندن میں بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔اسی لیے انگریزی میں بھی رواں تھی۔اس نے بیشکتاش (Besiktas) میں بحری میوزیم دیکھنے کا پوچھا۔

جنگی عجائب گھروں کا کیا دیکھنا؟ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہاں وہ بحریہ کا کمانڈر خیر الدین باربروسہ کا مزار بھی تو ہے۔ہمارا ایک بہت بڑا ہیرو جس کی ہیبت سے کبھی یورپ کو دندل پڑتی تھی ۔اُس کے لہجے میں تفاخر بڑا نمایاں تھا۔

ہمیں واقعتاً افسوس ہوا۔چلو ابھی تو ہیں نا یہیں ۔کہہ کر دل کو تسلی دی۔

سیکولر ترکی کے اسلام کی طرف رجحان سے متعلق کچھ سوالات کی ذہن میں کھلبلی سی تھی ۔اُن ہی کے بارے کچھ باتیں ہوئیں ۔

پہلی اہم بات ترکی ایک سیکولر ملک ہے۔میری ناقص رائے کے مطابق اسی سیکولرازم میں ہی اس کی بقا ہے۔اسمیں کوئی شک نہیں کہ موجودہ حکومتی لوگ مذہبی رجحان

رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ اتاترک کے قائم کردہ سیکولر نظام کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ فرقہ واریت کو روکنے کا یہی موثر ترین ہتھیار ہے۔

اتاترک جیسا لیڈر کہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔اُن کا دور انہی اصلاحات کا مقتضی تھا۔ جو انہوں نے اس وقت کیں۔ سچی بات ہے کچھ اتحادیوں اور کچھ اپنوں کے ہاتھوں ترکی ایک جاں بہ لب مریض کی طرح آخری سانسوں پر تھا۔ جہالت اور مذہبی تنگ نظری معاشرے میں جڑوں تک اُتری ہوئی تھی ۔تو اُس وقت وہی علاج کرنے کی ضرورت تھی جو اتاترک نے کیا۔ہاں کہیں کسی معاملے میں زیادتی بھی ہوئی کہ جب معاشرہ تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہو تو ایسا ہونا فطری امر ہے ۔طیب اردوان سے توقعات تو بہت ہیں ۔ترکی کی معیشت بہتر کرنے اور جمہوری اصلاحات لانے میں اُن کا ایجنڈا اور حکومت کے یہ تین سال بہت شاندار ہیں ۔مئیر کی حیثیت سے بھی انہوں نے خود کو منوایا ہے ہمیں ان کے مذہبی ہونے یا خاتون اول کے سکارف پہننے یا ری پبلکن پارٹی کے مقابلے پر نجم الدین اربکان ہی کی طرح کی اسلامی رحجان رکھنے والی جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی سے بھی کوئی غرض نہیں ۔اقتدار اُنکے پاس ہے یا کسی اور کے پاس ہو۔سوال صرف ملک کی بہتری اور ترقی سے ہے۔رہا مذہب تو وہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ نجم الدین اربکان کی رکن پارلیمنٹ مروہ کو حجاب کرنے کے سلسلے میں پارلیمنٹ کی سیٹ سے محروم کر دیا گیا تھا ۔ترکی کی پارلیمانی تاریخ کا یہ بہت گھٹیا فعل تھا۔

سیاسی پارٹیوں کے بارے میرے سوال پر انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے بہتیری ہیں۔ری پبلکن تو اتاترک نے بنائی۔ڈیموکریٹ پارٹی اس کے ساتھیوں نے کھڑی کی ۔جلال بایار،عدنان میندرس ،رفیق قرلتان اور خواد کوپرولو۔سعید نورسی اور نجم الدین اربکان اسلامی ذہن رکھنے والے لوگ تھے ۔وہ مختلف اوقات میں

پابندیاں لگنے کے باعث نئے نئے ناموں سے پارٹیاں بناتے رہے۔کہیں ملی نظام،کہیں رفاہ،کہیں فضیلت اورکہیں سعادت۔موجودہ طیب اردوان بھی انہی لوگوں کےنظریاتی رفیق ہیں۔مگر کہیں اختلافات پرانہوں نے جسٹس اینڈ ڈوپلمنٹ پارٹی بنائی۔یہی پارٹی آج کل حکمران ہے۔

یوں نائن الیون نے حالات بہت تبدیل کر دیئے ہیں۔مغربی طاقتیں بھی بڑے اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتری ہوئی ہیں۔میرے خیال میں لوگوں میں مذہبی،جذباتی ردّعمل کی شدت اسی بنا پر پیدا ہوئی ہے۔ضرورت ہے کہ برداشت،رواداری اوراحترام انسانیت معاشروں کاحسن بنے کہ اسی میں انکی عافیت ہے۔

جہاز کبھی یورپی کنارے کے ساتھ ساتھ چلتا اور کبھی درمیان میں آجاتا۔

Ortakoy کی مسجد کو دیکھنا بہت خوبصورت تھا۔ Beylerbeyiبیلر بیئی والےمحل میں مقیم سلطان عبدالحمید کشتی میں سوار ہو کر اسی مسجد میں نماز کیلئے آیا کرتے تھے۔یہ بھی ملاحت نے بتایا۔ایشیا اور یورپ کو ملانے والا پُل باسفورس برج دور سے دیکھا۔اسے اتاترک برج کا نام دیا گیا ہے۔

رومیلی حصار اور فاتح سلطان محمد برج دیکھے اوران کے بارے ملاحت سےتھوڑا سا سنا بھی۔جہاز نے ایشیا کی سمت ٹرن لیا۔اسکدار میں لنگرانداز ہوا تو ملاحت رخصت ہوئی۔مگر جانے سے قبل ہمیں The Leandros Tower کے بارے بتا گئی اور بیلر بی محل کو دیکھنے کی بھی تاکید کرتی گئی۔

اسکدار اور کیڈی کوئے ہم جا چکے تھے اور ٹاور کی کہانی بھی سن اور پڑھ چکے تھے۔

یہ سات نہیں نو جزیروں کی ایک خوبصورت لڑی سی استنبول کےایشیائی حصے کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔اس کے ساحلی حصے بوستنک Bostanicاور کارتل

Cartal سے قریب تر ہیں۔ایڈلر استنبول کے موتی ہیں۔ایک طرح یہ دنیا کے ہیرے کہلانے کے مستحق بھی ہیں۔گرمیوں میں خشک اور قدرے گرم، سردیوں میں تر اور معتدل۔ پرسکون، خاموش صنوبر اور دیودار کے جنگلوں سے ڈھنپے، سرسبز جھاڑیوں سے گھرے، آف وائٹ گھروں پر چڑھی بوگن ویلیا کی بیلوں، چمکتے ہوئے پیلے رنگوں کے موسا، میگنولیا کے پھولوں جوڈس اور چیری کے درختوں سے بھرے۔

یہاں تعمیراتی حسن اور فطرت کا حسن باہم گلوگیر ہوتے ہیں۔استنبول کے حکام کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح ان کے حسن خداداد کو نقصان نہ پہنچے۔آلودگی، دھویں اور دیگر کثافتی مواد سے انہیں ہر طرح بچایا جائے۔یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر قسم کی گاڑی پر پابندی ہے۔

یہ کوئی عثمانی خلفاء اور اُن کے ادوار کی دریافت نہیں۔صدیوں پرانے ہیں۔تب انہیں ڈیمونسوئی Demonisoi (ڈیمن کا آئی لینڈ Demon's Island کہا جاتا تھا۔یونانی فلاسفر نے اِسے پائن آئی لینڈ کا نام دیا۔)بازنطینی دور میں یہ Papadanisia کہلائے۔یعنی پادریوں کے جزیرے۔سزا یافتہ شہزادوں، امراء، نوابوں، شہزادیوں اور ملکاؤں کا کالا پانی تھا۔

''تو بھئی کیا خوبصورت کالا پانی تھا۔''

ایسا کالا پانی تو سب کو نصیب ہو۔

ترکوں نے اِسے کرمسن crimson کہا جس کا مطلب زمین کا رنگ و روپ سے ہے۔ترکوں کا عطا کردہ نام جمالیاتی نگاہ سے حقیقت کے زیادہ قریب ہے کہ زمین نے تو شاید اپنے حُسن کے سارے پوشیدہ خزانے یہاں انڈیل دیئے ہیں۔

ہماری بصارتوں میں ایک منظر ابھرا۔ایک خوبصورت جزیرے پر طلبہ کی ڈرل پی

ٹی کا منظر۔ منظم انداز میں بنی لائنوں میں کھڑے بچوں کی گہری نیلی نیکریں، آسمانی رنگ کی قمیصیں، انہی دو رنگوں کے امتزاج سے بنی نکٹائیاں۔ سفید جرابوں پر سیاہ بوٹ۔ یونیفارم کی یہ خوبصورت سی ہم رنگی، بینڈ کی گونجتی آواز اور بچوں کی ہاتھوں کی حرکات کی ہم آہنگی ایک ایسے دلفریب منظر کی آئینہ دار تھی کہ جس سے آنکھیں ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

یہ یاسیدہ yassiada آئی لینڈ تھا جو اسکول کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ ہمارے پاس کھڑے ایک ترک نے ہمیں بتایا تھا۔

ہمارا جہاز اتنے قریب سے ہو کر گزرا کہ بچوں کے چہروں پر پھیلی شادابی تک ہماری نظروں میں تھی۔ جیٹی بہت شاندار اور بچوں کا کھیل کا میدان وسیع و عریض جس کے گرداگرد سلاخ دار آہنی اونچی باؤنڈری تھی۔

ان جزیروں کی ساری تاریخ میں ان کا واحد ذریعہ زراعت اور مچھلی گیری رہی۔ ماہی گیری کے علاوہ انگوروں کی کاشت، پھل دار درختوں اور سبزیوں کی کاشت بھی ہوتی رہی تھی۔

ہمارا پہلا پڑاؤ اٹھارویں صدی کے وسط تک عثمانی خلفاء کے نظر انداز کردہ سب سے بڑے جزیرے بکوڈا Buyukada میں ہوا۔ اُس کا عثمانی ماضی اور بازنطینی دور تو بڑے دردناک تھے۔ 1930 میں یہاں سے سکندر اعظم کے باپ فلپس کے دور حکومت میں رائج سکے دریافت ہوئے تھے۔ پھاہے (پھانسی) لگائے جانے والے شہزادوں اور شہزادیوں کو بھی زیادہ تر یہیں بھیجا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں نئی لیجسلیٹو اصلاحات کے زیر اثر جب غیر ملکیوں کو حق ملکیت دیا گیا تو سب سے پہلے فرانسیسی آدھمکے۔ انہوں نے اِسے گرمائی مستقر بنادیا۔ پھر بھاپ کے سٹیمر چلنا شروع ہو گئے۔ ترقی کی نئی نئی اصلاحات نے اسے مزید نکھار دیا۔

اس کا حال بہت خوبصورت اور روح افزا بن گیا۔شاندار جیٹی سے جڑا خوبصورت لمبا راستہ، چوٹیوں سے سبزے کے رنگ و روپ شروع ہوتے اور پھیلتے پھیلتے آخری ڈھلانوں میں بنے خوبصورت گھروں میں نگاہوں کو اُلجھا دیتے ہیں۔چوٹی پر کوئی محل بھی نگینے کی سی صورت لیے دمک رہا تھا۔ہوگا کسی امیر کبیر آدمی کا محل مینارہ۔سڑکیں انتہائی خوبصورت جن پر دو گھوڑوں والی بگھیاں اور گدھا گاڑیاں بھاگی پھرتی تھیں۔لید کیلئے کپڑے بندھے تھے۔یہ فیصلہ میونسپلٹی کا ہی ہے کہ یہاں موٹر گاڑی کو ہرگز آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔اسی لیے ہمیں سڑکوں پر سائیکلوں پر سوار خوب روترک تربوزوں کے ساتھ نظر آتے تھے۔غیر ملکیوں کے ٹولے گشت کرتے اور کناروں پر بنے ریسٹورنٹوں میں کھاتے پیتے دکھتے تھے۔سائیکلیں کرائے پر ملتی ہیں۔جو چلانا چاہے لے اور سیر کرے۔

بگھی کی سیر کی۔سورج کی سنہری دھوپ میں نیلگوں گھاٹیوں کے کناروں پر بنے ریسٹورنٹوں میں کرسیوں پر بیٹھے، گپیں ہانکتے، کافی، چائے پیتے گورے سیاحوں کے پرے دیکھنا کیسا خوبصورت کھیل تھا۔ہم بگھی میں بیٹھے بیٹھے یہ کھیل کھیلتے رہے اور خوش ہوتے رہے۔

یہاں کی زیادہ آبادی یونانی اور آرمینیائی لوگوں کی ہے۔گرجے اور شیبی گاگوں کے ساتھ ساتھ مسجدیں بھی تھیں مگر کم کم۔

ظہر کی نماز کیلئے ہم چند گلیاں چھوڑ کر عقبی سمت میں گئے تو پھلوں اور سبزیوں کی دوکانوں پر سجے پھل اور خوش رنگ سبزیاں دیکھ کر حیران رہ گئے۔رنگوں میں تازگی کا حُسن اور جسامت میں بڑائی کا زعم انہیں بڑی انفرادیت دے رہا تھا۔ہم نے ٹھہر ٹھہر کر رک رک کر اُن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا اچھا تو یہ شملہ مرچ ہے۔ارے یہ کدو ہے۔باپ رے باپ۔''

مسجد چھوٹی سی تھی۔زنانہ حصّہ اوپر تھا۔وہاں دو شامی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ایک نوجوان اور دوسری کچھ ڈھلتی عمر کی۔سکول ٹیچرز تھیں۔ہمسائے ملک میں سیر کیلئے آئی تھیں۔تب شام اس دہشت گردی کا شکار نہیں تھا۔نوسومیل لمبی سرحد والے ہمسائے سے تعلقات بھی بہت اچھے تھے اور ان کی عورتوں کو کوئی خوف وخطرہ بھی نہ تھا۔نہ اپنے ملک میں اور نہ ہمسایوں کے کہ سرحدوں پر فراخدلی سے آنا جانا تھا۔

آیا آرینا Aya irina کی مناسٹری دیکھی۔ڈھائی گھنٹے کا یہاں قیام تھا۔مرمرا کے ساحل سے جڑے ریسٹورنٹ میں مچھلی کھائی۔ایسی بے سوادی کہ لقمہ اندر جانے کی بجائے باہر آتا تھا۔

Hey Bliada دوسرا بڑا جزیرہ تھا۔کسقدر منفرد اور خوبصورت۔ہمیں تو یوں لگا تھا جیسے کوئی جل پری اپنے لمبے لہراتے بل کھاتے بالوں کو پل پل جھٹکے دیتی ہمیں خوش آمدید کہتی ہو۔نیلگوں دھندلی سی فضاؤں میں خوبصورت سیاح کرسیوں پر بیٹھے لہروں کو تکتے اور عقب میں گھر اور پہاڑ کی سبزے سے بھری دور دور تک پھیلی ڈھلانوں کو گویا جیسے نیچے پھسلتی آتی ہوں کو دیکھتے تھے۔

تاہم اس جزیرے پر ایک ایسا منظر دیکھنے کو ملا جسے دیکھنا اور اس کے حسن کو اپنی پوری توانائی کے ساتھ محسوس کرنا گویا اُس سارے دن کا ایک انعام تھا۔آبی پرندوں کی قطاریں سینکڑوں کی تعداد میں ایک ترتیب سے اڑتی ہوئی نیچے پانیوں پر اُترتی تھیں۔دودھیا سفید مرغابیوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور سبک سر کے سے انداز میں اُنکا فضا سے اُتر کر پانیوں پر تیرنے کو کاش میں شعروں میں ڈھال سکتی۔کاش میں شاعرہ ہوتی۔

جہاز تیسرے بڑے جزیرے برگزدہ Burgazada پر تھوڑی دیر کیلئے رُکا۔عمارات کا ایک مسلسل بہاؤ تھا۔جو ساتھ ساتھ بہتا چلا آرہا تھا۔ایک کٹاؤ ختم ہوتا تو

دوسرا شروع ہو جاتا ۔جیٹی بڑی شاندار سی تھی ۔خاکستری پہاڑیاں لم لیٹ ہوئی پڑی تھیں ۔دو منزلہ ،سہ منزلہ گھروں اور ہوٹلوں کا پھیلاؤ کچھ ایسا تھا کہ جیسے کسی مہ جبین نے گلے میں ست رنگا ہار پہنا ہوا ہو جو ناف کو چھوتا ہو۔

اس جزیرے بارے تاریخ دان کہتے ہیں کہ پہلا تاریخی واقعہ 11 قبل مسیح میں یہاں پیش آیا ۔سکندر اعظم کے کمانڈر Antigonos کا بیٹا Dimitrios آبنائے استنبول پر دوبارہ قبضے کیلئے Lisimakhos سے جنگ کر بیٹھا ۔اُس نے Burgazada نامی جزیرے پر ایک قلعہ بنوایا اور اُسے اپنے باپ برگ زادہ کا نام دیا۔

Kinalida جزیرے کی تو بات ہی نرالی تھی ۔جیسے سمندر میں تیرتا ہنستا مسکراتا پھول ۔یہاں سبزہ کم تھا ۔جزیرہ کنارے کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ سٹیمر ،کشتی یا لانچ کے رُکتے ہی اگر کوئی شوقین چاہے تو فی الفور سمندر میں تیراکی کیلئے اتر سکتا ہے ۔گائیڈ نے بتایا تھا کہ یہیں یونانی چرچ میں وہ بازنطینی افواج کا کمانڈر انچیف جس نے سلجوقوں سے شکست کھائی تھی اور جسے سلطان الپ ارسلان نے یہاں بھیجا تھا ۔زمانوں تک وہ یہیں ایک Monastary میں رہا ۔اور یہیں دفن ہوا ۔اس کی قبر یونانی چرچ میں ہے ۔تو بھئی اسے دیکھنے کیلئے اُترے ۔دیکھا اور دعائے خیر بھی کی ۔یہاں فٹن نہیں تھی ۔بس سائیکلوں پر لوگ چڑھے گھومتے پھرتے تھے ۔یا پھر اس کی گلیوں میں پیدل مارچ ہو رہا تھا ۔سیاح یہاں کم ہی تھے۔

Sedef Adasi میں پڑاؤ بس آدھا گھنٹہ کا تھا ۔اس کے بارے پتہ چلا کہ بیسویں صدی میں آباد ہوا ۔سبزہ بہت تھا ۔مکانات ایسے شاندار تھے کہ نظر نہ ٹکتی تھی ۔چاروں طرف قدرتی ساحل تیراکی کیلئے موجود تھے اور گوروں کے جم غفیر نے اُدھم مچا رکھا تھا۔

اس کی گلیوں اور شاہراوں میں سجے گرجا گھر ،خانقاہیں ،گھر اور بازاریوں نظر

آئے تھے جیسے کسی بھری دوپہر میں سرسبز املتاس کے درخت پر کھلے کچے پیلے رنگ کے پھول اور ان پر لٹکتی پھلیاں ۔یہ بھی ایک قید خانہ تھا۔رومنوں کے شہزادوں اور شہزادیوں کا اُن کی سربرآوردہ شخصیات کا۔

نوکا تو بس بہانہ ہی تھا۔پانچ جزیروں کے بعد ہی واپسی ہوگئی تھی ۔پیسے نو کے لیے اور دکھائے پانچ۔ہم کیا بولتے ۔کہیں کوئی اور آواز نہیں تھی ۔

باب نمبر:۱۷ اسکدار اور کیڈی کوئے

۱۔ ترکی میں ختنے کی رسم بڑے تزک و اہتمام سے منائی جاتی ہے۔

۲۔ استنبول کے قبرستان بڑی شان اور رکھ رکھاؤ والے ہیں۔

۳۔ دنیا بھر میں قدیم یادگاروں سے منسوب روایتی کہانیاں کم و بیش تھوڑے بہت فرق سے ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔

۴۔ احتجاج کا ایک طریقہ گھروں میں برتن بجانا بھی ہے۔

اُسکدار استنبول کے ایشیائی حصے کا سب سے بڑا ضلع ہےتو واقعی اس کے خدوخال میں بھی مشرقیت کے رچاؤ کا غلبہ ہے۔ایمی نونو سے فیری کے ذریعے اسکدار پہنچنے میں کتنا وقت لگا ہوگا۔زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ کا۔فیری پانیوں کو چیرتی ہوئی اتنی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی گئی کہ پانیوں میں کھڑا لینڈورس Leandros ٹاور کے بارے جنوبی ایشیا کے چپٹی ناکوں اور تکونی آنکھوں والے سیاحوں کے ٹولے کو انگریزی میں بتاتے گائیڈ کا بیان بھی ادھورا رہ گیا۔ہم نے کف افسوس ملتے ہوئے سوچا ’’ہائے یہ تو بڑی رومانی سی داستان ہے۔‘‘

مزے کی بات کہ سب نے جیٹی پر آکر اُسے پھر دائرے میں لے لیا اور بیان جاری رکھنے کو کہا۔سوچا آخر حرج کیا ہے کہ بہتی گنگا میں دو چار ڈبکیاں ہم بھی لگا لیں۔سو ساتھ چپکے رہے۔

تینوں کہانیاں بڑی روایتی سی تھیں۔اس کے باوجود بیان میں جوزور شور اور اُتار

چڑھاؤ تھا اُسنے بڑا مزہ دیا۔ بازنطینی شہنشاہ کی لاڈلی بیٹی جس کے بارے پیشین گوئی تھی کہ وہ زہریلا سیب کھانے سے مر جائے گی۔ سالوں رعنا سی شہزادی کو یہاں قید میں رکھا گیا۔ چڑیل سیبوں کے ساتھ ایک دن نمودار ہوئی۔ زہریلا سیب لڑکی کو دیا اور وہ کھانے سے مر گئی۔

دوسری کہانی سانپ کے ڈسنے سے متعلق تھی۔ شہزادی کا دل انگور کھانے کو چاہتا تھا۔ انگوروں کی پیٹی لائی گئی جسمیں کنڈلی مارے سانپ نے کام کر دکھایا۔

تیسری ہماری سوہنی مہینوال جیسی تھی مگر درمیان میں مشرقی محبوبہ کی دلیری اور جی داری ہے۔ جو اسے حاصل ہے کہ سوہنی محبوب سے ملنے جاتی تھی لہروں کو چیرتے پھاڑتے۔ جبکہ حرا Hera جو ایک راہبہ تھی اُس سے ملنے اُس کا محبوب لیونڈورس Leandros لہروں کا سینہ چیرتے ہوئے آتا تھا۔ ایک رات جب سمندر میں طوفان تھا وہ اُس روشنی کو دیکھ نہ سکا جو اُسکی محبوبہ کنارے پر لیئے کھڑی تھی۔ طوفان بڑا زبردست تھا۔ مقابلہ نہ کر سکا اور ڈوب گیا۔

ہاں البتہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ ایتھنز Athens اور اسپارٹا کے درمیان جنگ ہوئی۔ ال کلبیڈس Alkibades نے حکم دیا کہ یہاں قلعہ بنایا جائے۔ بادشاہوں کو ریس کرنے کی تو بُری عادت ہوتی ہے نا۔ جب سلطان محمد دوم نے قسطنطنیہ فتح کیا تو اس نے بھی اِس ڈر سے کہ وہ کہیں پیچھے نہ رہ جائے۔ ایک اور قلعے اور توپوں سے اسے بھی سجا لیا۔ اِس سے لائٹ ہاؤس کا کام بھی لیا گیا۔ وقتاً فوقتاً یہ جیل خانہ بھی بنا۔ اسپتال جیسی خدمات بھی سرانجام دیں اور اب کنٹرول اسٹیشن کا کام کر رہا ہے۔ واقعی کیسی مزے کی داستان ہے اس کی۔

اب دائیں بائیں دیکھتے ہوئے جونہی ذرا آگے بڑھے۔ پہلا ٹکراؤ ایک پاکستانی

لڑکے سے ہوا۔داستان غم بڑی غمناک سی تھی کہ دو سال ہوئے بے چارے کو استنبول سے آگے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔کسی سٹور پر ملازم تھا۔رات کو سونے کی سہولت تھی۔مالک بھی اچھے تھے۔روٹی پانی کا خیال بھی کر لیتے تھے۔

لڑکے کا نام آصف تھا۔کو گریجوایٹ تھا مگر بہت ذہین اور سمجھدار لگتا تھا۔

اُسے اُسکدار سے واقفیت ہی نہ تھی بلکہ اسکی تاریخ سے بھی خاصا واقف تھا۔لوگوں کے بارے میں بڑا دوٹوک تھا۔اچھے محبت والے لوگ ہیں۔

راہولی کے کسی پس ماندہ سے گاؤں کے لڑکے کے ان کی مسلمانیت پر تحفظات ضرور تھے۔لڑکے لڑکیوں کا راتوں کو شرابیں پینے اور رموج مستی والے کام بھی اس کے نزدیک کچھ اتنے پسندیدہ نہیں تھے۔مگر تقابلی جائزوں میں اُسکی ذہنی بلوغت کا پتہ چلتا تھا کہ پاکستانی دیہاتی علاقوں میں مذہب کی آڑ اور تاریکیوں میں جو تماشے ہوتے ہیں وہ اُن سے آگاہ تھا۔اپنے معاشرے کی منافقتوں پر بڑا شاکی تھا۔ہم لوگوں نے مذہب کو بھی تجارت بنا لیا ہے۔یہاں کم از کم یہ چیز تو نہیں۔اُسے اُنکا کاموں کو جلدی جلدی کرنا، کاروباری اور ذاتی معاملات میں ایماندار ہونا بہت پسند تھا۔ہمارے جیسے نہیں ہیں یہ پھلکے، سُستی کی پنڈیں اور بے ایمان۔

رمضان کی رونقوں کا اُسنے خصوصی ذکر کیا۔تراویح اور ستائیسویں کی رات کو مسجدوں میں بڑا رش ہوتا ہے۔ہماری طرح مولوی لمبے لمبے خطبے نہیں دیتے۔مختصر نماز اور مختصر خطبہ۔مولوی لوگ پڑھے لکھے، صاحب علم، داڑھی مونچھ سے تقریباً بے نیاز، پینٹ کوٹوں میں ملبوس بڑے خوبصورت لگتے ہیں۔

ہم نے اُسکدار میں ہوٹلوں کی بابت جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ یہاں معقول قسم کا کمرہ تقریباً نصف سے بھی کم قیمت پر دستیاب ہے جو اس وقت ہم سلطان احمد ایریا میں دے

رہے تھے۔اب افسوس شروع ہوگیا کہ یہاں کیوں نہ آ گئے ؟میری پیچ پیچ پر سیما نے کہا۔

''ارے ناشکری عورت بس بھی کر۔شہر کے مرکز میں بیٹھے ہیں۔یہاں پانیوں پر ہی تیرتے رہنا تھا۔جتنی بچت ہوتی وہ لانچوں،فیریوں کے ترنوں میں چڑھ جانی تھی۔''

بس تو ناشکری عورت نے شکر کیا۔

آصف نے محبت بھرا اصرار کیا کہ اُسے خدمت کا موقع دیں۔اب بہتیرا ٹال مٹول کی۔مگر وہ تو کچھ نہ کچھ کھلانے پر تلا ہوا تھا۔گھسیٹ کر ایک دوکان پر لے جانے کی کوشش ہم نے ناکام بنا دی۔منت طرلوں سے گویا ہم نے بھی قسم کھالی تھی کہ بیچارے پردیسی کا ٹکا نہیں خرچوانا۔ہاں البتہ قہوہ پینے پر آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔

قہوہ خانہ بڑا روایتی تھا۔پیڑھے ٹائپ بیٹھنے کی کرسیاں آرام دہ تھیں۔چسکیاں لے لے کر قہوہ پینا اور اردگرد کے منظروں سے آنکھیں سیکنا بڑے مزے کا شغل تھا۔لڑکے بالے حقّے اُٹھائے گاہکوں کے آگے رکھ رہے تھے۔بوٹ پالش کرنے والا ایک چھوکرہ ہمارے پاس آ کر ہمارے پیروں کو دیکھنے لگا۔کینوس کے جوتوں پر کیا پالش کرواتے۔بل فوراً ادا کر دیا۔لڑکے کا اصرار اور ہماری مزاحمت کو سروس دینے والے نے بڑی دلچسپی سے ہنستے ہوئے دیکھا اور کچھ کہا بھی۔ہمارے پلّے کیا پڑنا تھا۔آصف نے ہی بتایا کہ کہتا ہے۔آپ لوگ جھگڑا مت کریں۔دونوں پیسے مجھے دے دیں۔

آگے بڑھے تو سیل لگی ہوئی تھی۔بڑوں اور بچوں کے ریڈی میڈ کپڑوں،سوئٹروں،جیکٹوں،سکارف،چمڑے کے بیگ،نقلی جیولری۔اب اللہ دے اور بندہ لے۔سیما تو یوں لپکی اور جھپٹی کہ مانو جیسے مال مفت تقسیم ہو رہا ہو۔میں نے بظاہر رجی پُجی عورت کی طرح سب پر نگاہ ڈالی۔قیمتوں کا پاکستانی روپے سے جوڑ توڑ کیا اور دل ہی دل میں لعنت بھیجتے ہوئے ایک جرابوں کا جوڑا ایک لیرے کا ضرور اٹھا لیا کہ چلو انگلی کٹا کر

شہیدوں میں تو شامل ہوجاؤں۔اُسکدار کی کوئی تو سوغات ہو۔

یہ سیما کی خواہش تھی کہ سلیمان ذی شان اور حورم کی لاڈلی بیٹی مہر ماہ کی مسجد کی زیارت ضرور کرنی ہےاور نفل بھی پڑھنے ہیں۔یہ چاند چہرہ اور لاڈو مہر ماہ رستم پاشا کی بڑی دلاری بیوی تھی ۔مسجد سنان کے ہاتھوں کا شاہکار ہے۔اس کے اندر ہم داخل ہی ہوئے تھے کہ ہمارے پیچھے خواتین کا ایک بڑا سا ریوڑ ہاتھوں میں خریدوفروخت کے تھیلے اٹھائے ہنستے مسکراتے داخل ہوا۔ان میں اگر حجاب اور عبایا والی خواتین تھیں تو وہیں ننگی ٹانگوں اور اونچے سکرٹوں میں ملبوس نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔میں نے قدرے حیرت سے اِس منظر کو دیکھا اور ذرا ایک جانب ہوئی کہ دیکھوں تو سہی مسجد کے اندران کا داخلہ کیسے ہوتا ہے؟

لڑکیوں نے کمال اطمینان سے اپنے تھیلوں میں سے ایک کُھلا کپڑا نکالا۔ٹانگوں پر لپیٹا۔سروں پر رومال ڈالے مزے سے اپنے مخصوص حصّے میں چلی گئیں۔تعاقب میں ہم بھی آگے بڑھے۔روشن خیالی، رواداری اور برداشت کا یہ بڑا پُراثر سا منظر تھا۔حجاب والیوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا ان کے اس لباس پر اور نہ لڑکیوں کو کوئی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔اندر بھی ایسے ہی منظر تھے۔ٹانگوں کو کور کرنے والیوں نے اگر فرض نماز پڑھی تو دو تین ویسے ہی بیٹھی بیج کھاتی رہیں۔کسی کو کسی پر اعتراض نہیں تھا۔بات چیت کی کوشش تو بہتری کی مگر سب انگریزی سے نابلد تھیں۔

آخر یہ جنوبی ایشیا کے عالم لوگ اتنے متعصب اور تنگ نظر کیوں ہیں؟ مسجدوں میں خواتین کو گھسنے ہی نہیں دیتے۔ڈرڈر جیسا پوسٹر چہرے پر سجا کر دفع دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سری لنکا کے شہر انورادھاپور میں میرے ساتھ جو ہوا وہ تو کبھی بھولتا ہی نہیں۔مشرق وسطٰی میں تو چوتھا حصّہ خواتین کیلئے مخصوص ہے۔ہمارے ہاں چوتھا چھوڑ پانچواں تو

ہونا چاہیے۔آصف باہر ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔

ہمارے یہ پُوچھنے پر کہ یہاں کی کوئی خاص چیز کوئی سوغات یا کوئی یادگار کیا چیز دیکھنے والی ہے۔اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

یہاں ختنے کی رسم بہت مزے کی ہوتی ہے۔دیہاتوں میں تو بہت دھوم دھام والا سماں ہوتا ہے مگر شہروں میں بھی اس کا بےحد اہتمام ہے۔

چھوٹا بچہ جسے زرق برق کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔چمکدار کپڑے کی ٹوپی، پشت پر لہراتا کڑھائی سے مزین ہڈ اور ہمارے ہاں کی جیکٹوں جیسی واسکٹیں جو شوخ چمکدار طلاکشی کے کام سے مزین ہوتی ہیں۔سجے سنورے گھوڑے پر بٹھا کر سواری کروائی جاتی ہے۔بڑا دھوم دھڑ کا ہوتا ہے۔اگر بچہ بہت ہی چھوٹا ہو تو کوئی اُسکا چاچا،ماما یا باپ گود میں لے کر گھوڑے پر بیٹھتا ہے۔کھانے بھی پکتے ہیں اور رشتہ دار بھی مدعو ہوتے ہیں اور اجنبی بھی چاہیں تو شوق سے شامل ہو جائیں۔

دور دراز کے دیہاتوں میں کشتی بھی بہت پسند کی جاتی ہے۔میرے مالکوں کا آبائی گھر انقرہ کی طرف ہے۔دونوں میٹھی عیدوں پر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔کشتی کے منظر ہمارے ہاں جیسے ہی تھے۔ڈھول کا بجنا،جسموں پر تیل کا ملنا،لوگوں کے جمگھٹے شور، تالیاں اور سیٹیاں بہت مزہ آتا ہے۔مجھے تو اپنا وطن رہ رہ کر یاد آیا تھا۔

آصف بڑا جذباتی سا ہوگیا تھا۔ہم نے بھی اُس کی ہوم سکنس کو محسوس کیا۔دلداری کی۔اچھے دنوں کی نوید سنائی۔تھوڑی دیر بعد جب وہ اس جذباتی کیفیت سے نکلا تو بولا۔دوسرے یہاں خاص طور پر اُسکدار میں درویشوں کا ایک ناچ ہوتا ہے۔

میں نے بات کاٹی وہ مولانا رومی کے درویشوں والا۔

''نہیں نہیں۔یہ ایک اور طرح کا ہے۔اس کے درویش اونچے اونچے روتے اور

شور مچاتے ہیں۔یوں لگتا ہے جیسے اُن پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو۔ان کے چہروں کو بھیڑ کی کھالوں سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ان کا قائد شیخ پھر ان کے جسموں کے اوپر سے گزرتا ہے۔یہ پیروں کی برکت کا عمل ہے۔

درویشوں کے ناچ کا وقت رات کو تھا اور ختنے کی رسم دیکھنے کیلئے ہمارے بچپن کے زمانوں کے خسروں جیسا صبر اور گلی گلی،کوچہ کوچہ خواری کی ضرورت تھی جو وہ کرتے تھے یہ جاننے کیلئے کہ منڈا کس گھر ہوا ہے؟

نہ بابا نہ جوانی ہوتی تو نکل پڑتے اور ڈھونڈ لیتے کہ ختنے کی رسم کس گھر میں منائی جارہی ہے۔

ایک دلچسپ اور مزے کی بات اُس سے اور بھی سُنی کہ جب کبھی حکومت یا ضلعی انتظامیہ کے خلاف کوئی احتجاج کرنا ہوتو گھروں میں برتن بجائے جاتے ہیں۔

ارے ہم دونوں ہنس پڑی۔بڑی مزے کی بات ہے۔

اس نے قبرستانوں کی بھی بڑی تعریف کی۔بلکہ ایک میں تو لے بھی گیا۔یہ قریب تھا۔ وہاں تو فنکاری کے نمونے تھے۔استنبول کے مسلمان اسکدار کے قبرستانوں میں دفن ہونا پسند کرتے تھے۔سرو کے درختوں کی ایک طرح باڑھوں میں،گلاب کے پھولوں میں آرام کرتے بہت بڑے لوگ،چھوٹے لوگ سب جائے عبرت ہوئے پڑے ہیں۔کسی کو فرصت ہو،اس کے پاس وقت ہوتو وہ ان کے درمیان گھوم پھر کر کتبوں پر لکھے ان کے نام پڑھے اور سرہانے ٹنگی پگڑیوں سے ان کے عہدوں اور مرتبے جان لے۔چند لمحوں کیلئے رُک کر انگریزی کی وہ لازوال نظم اگر اُسے یاد ہے دہرائے۔

old and young and rich and poor

we all end up under this green floor

some of us come and lay some flowers
some even lay under tall marble towers
Names on the stones nearly worn away
what a sad end to a perfect day.

نہیں تو دنیا کی بے ثباتی پرنم گیر آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں سے دو لفظ کہہ کر باہر نکلے اور دنیا کی بھیڑ میں کھو جائے۔

اسکدار تاریخ اس کی بھی بہت پرانی ہے۔زمانوں پہلے عیسائیوں کی آبادی تھی۔رومن اور بازنطینی ادوار میں یہ شہر کی حدود سے باہر کا علاقہ تھا۔ایک طرح سے اسے فوجی چھاؤنی کہہ سکتے ہیں۔اس کا نام بھی سکوتری اسی بنیاد پر پڑا تھا۔تھوڑے بہت ردّ و بدل سے اسکدار رہ گیا۔یہاں بہت سے محلات ہیں۔آصف کی خواہش پر بھی ہم نے دیکھنے سے انکار کیا۔مسجدیں تو قدم قدم پر نظر آتی تھیں دراصل اتنی مسجدیں دیکھ چکے تھے اور ان کے اندر کے حُسن اور فنکاری کی بہتی بہتات سے گلے گلے تک سیراب ہو چکے تھے۔

اتنے بڑے اُسکدار کی سیر کا بہترین اور سستا طریقہ جو ہمارے ذہن میں آیا وہ بس پر چڑھ جانے کا تھا۔اور ہم چڑھ گئے۔نہ لوگوں کو انگریزی آئے اور نہ ٹکٹ کاٹنے والوں کو۔جو میں نے لمبے لمبے اشارے اور تمثیل کاری کی وہ بھی لاجواب تھی۔ایک لڑکا کچھ کچھ سمجھا۔کہیں نہیں اُترنا۔کیڈی کوئے جانا ہے سیدھا۔وہاں بھی سیر کرنی ہے۔اب یاد نہیں کتنے لیروں کا ٹکٹ خریدا۔مگر مزہ آیا۔حُسن اور خوبصورتی دیکھی۔

منظروں کی ایک لکن میٹی تھی جو ہمارے ساتھ کھیل رہی تھی۔نیلگوں بہتے پانیوں کے ساتھ ساتھ ایک بہاؤ سبزے کا بھی تھا۔مزے کی بات یہاں کے سدا بہار دیودار ہمارے ہاں کی طرح دراز قامت نہیں۔پستہ قامت ہیں۔ہمارے تو ماشاءاللہ سے لگتا ہے جیسے اللہ

میاں سے راز و نیاز کرنے کیلئے سروں کو آسمان میں گھسیڑ رہے ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال چیڑ کے پیڑوں کا ہے۔ جن کے درمیان سُرخ چھتوں والے گھر، سفید گنبدوں اور بلند میناروالی مسجدیں لشکارے سی مارتیں۔ سہ منزلہ، چہار منزلہ فلیٹوں کے سلسلوں کا بھی بڑا پھیلاؤ تھا۔ سلطانوں کے سفید محلات کی اپنی شان تھی۔ صفائی ستھرائی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں متوسط آبادیوں میں اڑتے پھرتے آوارہ کاغذوں کے ٹکڑے، شاپر اور گندمند بھی نظر آئے۔ اب بس بھوک سے بُرا حال تھا۔ جگہ جگہ کافی شاپ اور قہوے کے خوبصورت کھوکھے تھے۔ واضح رہے کہ یہ بڑے ماڈرن کھوکھے ہیں ہماری کڑک چائے جیسے نہیں۔

بسکٹ کھائے۔ قہوہ پیا۔ تازہ دم ہو کر تھوڑی سی سیر کی۔ ایک کھلے میدان میں بچوں کو فٹ بال کھیلتے دیکھا۔ سُرخ وسفید رنگوں والے بچے کس والہانہ جوش وخروش سے کھیلنے میں مگن تھے۔ فٹ بال ترکی کا قومی کھیل ہے۔ یہاں بہت سبزہ تھا۔ کیڈی کوئے میں چوبی مکان بڑے منفرد سے دکھائی دیئے۔ حیدر پاشا کا ریلوے اسٹیشن دیکھا مگر دور سے۔ پانیوں میں کھڑی ایک عظیم الشان سی عمارت جس کا طرز تعمیر کچھ کچھ گوتھک سٹائل جیسا نظر آتا تھا۔

باب نمبر:۱۸ الوداع استنبول

۱۔ ایک شکایت اور ڈھیر ساری حکایتیں

۲۔ رالف رسل کی نظریاتی وابستگی کی شدت میرے لیے، ہمیشہ پسندیدہ رہی۔

۳۔ تم آباد رہو، شاد رہو۔ تمہارے کھیت کھلیان سرسبز و شاداب رہیں اور تمہارے آنگن سیاحوں سے بھرے پُرے رہیں (آمین)

تو آج شام اندھیرے اُجالے کے کسی لُکن میٹی لمحے میں استنبول سے رُخصت ہو جانا ہے۔ دنیا کی حسین ترین مسجدوں والا یہ شہر جس کے چپے چپے پر ماضی کی عظمتوں اور تہذیبوں کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔

میں ایک عجیب سی گومگو کیفیت میں سوالوں کی سان پر چڑھی کھڑی ہوں جنہوں نے مجھ سے بار بار پوچھا ہے کہ استنبول سے میرا کوئی ناطہ ہے یا نہیں۔ اس کے حُسن و خوبصورتی کے رنگوں، اسکی تاریخ، اس کی تہذیب پر کہیں میرے لیے بھی فخر کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں۔

اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ آنکھوں میں اندر کے درد کی تھوڑی سی رڑک بھی تنگ کر رہی ہے۔ یہ بھی سمجھ نہیں آرہا ہے کہ جذبات کا اظہار کیونکر ہو۔ دراصل میرے ملک کے ترقی پسند دوست لکھاری اور کالم نگار کچھ عرصے سے مجھ جیسے جاہل اور گنوار لوگوں کو یہ باور کروانے میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں کہ خاطر جمع رکھو۔ ''یہ ہم تھے '' کہنا چھوڑ دو۔

ماضی کا شاندار اسلامی ورثہ تمہارا نہیں عربوں کا تھا، کہیں ترکوں کا تھا، کہیں

خراسانیوں اور کہیں وسط ایشیا کے مسلمانوں کا تھا۔بس خیال رہے کہ تم ہندی اور اب پاکستانی مسلمانوں کا ہرگز نہیں۔

اب آپ سے کیا پردہ؟محسوس تو کچھ یوں ہونے لگا تھا جیسے مجھے دن دہاڑے لوٹ لیا گیا ہے۔ظالموں نے میرا سب کچھ چھین کر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر کسی نوزائیدہ ناجائز بچے کی طرح پھینک دیا ہے۔

سچ تو یہی ہے میں تو اتنا جانتی ہوں کہ جب سے شعوری ہوش سنبھالا اور کتابوں سے دوستی ہوئی تو جبل الطارق پر کھڑا ،اپنی کشتیوں کو جلاتا ،اپنی واپسی کے راستے بند کرتا ،اپنے ساتھیوں کے اندر شجاعت و دلیری کی رُوح پھونکتا اس دلیر اور دلبر سے طارق بن زیاد سے میرا ایک رشتہ استوار ہوا تھا۔محبت کا رشتہ،عقیدت کا رشتہ،فخر اور ناز کا رشتہ۔کچھ ایسا ہی تعلق اُس نوخیز دلکش اور من موہنے سے محمد بن قاسم سے محسوس ہوتا تھا۔

سکول کے زمانے سے ہی درسی کتابوں نے جابر بن حیان اور سترھویں صدی تک یورپ کی درسگاہوں میں پڑھایا جانے والا وہ ابن الہیثم، طب کی دنیا کا وہ بوعلی سینا،وہ البیرونی،اسحاق الکندی ،ذکریا الرازی کتنے لوگ میرے ہیرو بن گئے تھے۔ذہن نے بلوغت پکڑی۔درسی کتابوں سائنس، تاریخ اور جغرافیہ سے ذرا نکلی تو ڈھیروں ڈھیر اولوگوں سے ملاقات ہونے لگی تھی جو شاعر ،ادیب ،فلاسفر،موسیقار تھے۔جنہوں نے اپنے اپنے زمانوں میں اپنے اپنے میدانوں میں بڑا نام پیدا کیا۔انسانی فکر اور سوچ کو متاثر کیا اور اُسے جلا بخشی۔

فرزندان زمین میں بھی ڈھیروں ڈھیر نام ہیں ۔دراصل شعور کی وسعتوں نے رنگ، نسل، زبان تہذیب و ثقافت اور وطنیت کے رشتے کو بھی اتنا ہی اہم گردانا جتنا مذہبی تعلق کو اور ان حوالوں سے مجھے اُن کے ساتھ بھی محبت کی ڈوری میں باندھ دیا ہے۔تاہم

اس وقت میرا مسئلہ برصغیر کی قدیم ترین وراثت یا اُس کی شخصیات سے اپنے رشتے ناطے کے حوالے سے نہیں بلکہ مسلمان خارجیوں (میرے مطابق) سے تعلق کی بحث کا ہے۔یہ ایسے ہی ہے جیسے کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا نکاح کے چار بولوں کی چھتر چھاؤں تلے دھان متی کا کنبہ بن جاتا ہے۔کلمے کے چار بولوں کا بھی کچھ ایسا ہی کردار ہے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ اگر میں اُن سب کے ساتھ ناطے کی ایک ڈور میں بندھی ہوئی تھی۔مجھے اُن پر فخر تھا،غرور تھا اور رشتے کے اس ریشمی احساس میں ان میٹھے سے جذبات میں ایسی کڑوی سوچ کا تو کہیں کوسوں دور تک کوئی وجود ہی نہیں تھا کہ وہ عرب تھے،ترک تھے،تاتاری یا چنگیزی تھے اور میں جنوب مشرقی ایشیا کے ایک پس ماندہ ملک کی مسلمان عجمی ہوں۔پہلے ہندی مسلمان اب پاکستانی مسلمان۔ایک مفلوک الحال ملک کی شہری۔

تو کیا میں پاگل تھی۔دمشق میں صلاح الدین ایوبی کے مقبرے پر روتی تھی۔اُسے کہتی تھی صلاح الدین تم سو رہے ہو۔تم نے کب تک سوتے رہنا ہے؟مسلم دُنیا کتنی زبوں حالی کا شکار ہے۔تمہیں کچھ خبر بھی ہے۔صلاح الدین تمہاری نیند کتنی لمبی ہوگئی ہے؟تم اس وقت بھی سو رہے تھے جب وہ ہوچھا فرانسیسی جنرل ہنری گورو فرانس کو مال غنیمت کے طور پر ملنے والے ملک شام میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوا تھا اُس نے جوتا تمہارے مقبرے پر مارتے ہوئے کہا تھا۔

''صلاح الدین ہم واپس آگئے ہیں۔ہم نے ہلالی پرچم سرنگوں کردیا ہے۔صلیب ایک بار پھر سربلند ہے۔''

اس وقت تک میں نے صلاح الدین کو کرد نہیں سمجھا تھا۔وہ تو میرا تھا۔میرا اپنا۔حمص میں خالد بن ولید کے روضہ مبارک پر فاتحہ پڑھتے ہوئے بھی میری آنکھوں سے

آنسو رواں تھے۔خالد بن ولید سے کون سا کم گہرا تعلق تھا۔وہ عرب تھا۔سوچ یا گمان کے کسی حصّے میں بھی اُس کے عرب ہونے کا کوئی احساس تک نہیں تھا۔

سری لنکا کے ساحلوں پر پھرتے ہوئے مجھے اُن عرب تاجروں پر فخر محسوس ہوا تھا جن کی ناپ تول کے پیمانے صحیح اور ایمانداری ایسی بے مثل تھی کہ مقامی لوگوں نے بے اختیار اُس دین کو گلے لگایا جس کے وہ تاجر پیروکار تھے۔وہ سب عرب تاجر میرے اپنے تھے۔

کیا یہ میری غلطی تھی کہ میں نے خود کو اُس ڈور سے جڑا ہوا سمجھا۔پر اسمیں اُن لوگوں کا بھی تو قصور تھا جنہوں نے مجھے اسکا احساس دیا۔اب میں کیسے اُس مصری ٹیکسی ڈرائیور کو بھول جاؤں جس نے مجھے صرف اسی تخصیص،اسی پہچان پر عزت واحترام دیا۔

تو ذرا سنیے یہ قصہ بھی۔ہم لوگ اسکندریہ سے واپس قاہرہ آرہے تھے۔اسٹیشن جانے کیلئے کسی ٹیکسی کی تلاش میں کھڑے تھے۔ایک ٹیکسی قریب آکر رکی۔استفسار ہوا کہاں جانا ہے؟ بتایا گیا۔دس مصری پونڈ کرایہ ہوگا۔بڑے کاروباری انداز میں کہا گیا۔دفعتاً اُس نے پوچھا۔انڈین۔نہیں میں نے فوراً کہا۔پاکستانی۔''مسلمان ہیں'' ''جی ہاں'' میرا جواب تھا۔الحمد اللہ۔پُر مسرت آواز میں کہا گیا۔

''کھڑی کیوں ہو۔دروازہ کھولو اور بیٹھو۔ہاں کرایہ میں صرف پانچ مصری پاونڈ لوں گا۔''

اب بھلا میری آنکھیں نہ بھیگتیں۔میرا کیا رشتہ تھا۔یہی رشتہ جو کہنے کو اگر مظبوط اور طاقتور ہے تو بودا بھی ہے۔

ضیاالحق پنجابی تھا۔میرا وطنی تھا مگر میری اُس سے شدید نفرت تب سے ہے جب اُس نے فلسطینیوں پر ٹینک توپیں چلائیں۔فلسطینی کاز کو نقصان پہنچایا۔

بغداد میں امام ابوحنیفہ کے مزار اقدس پر بیٹھے ڈاکٹر قاسی سے باتیں کرتے ہوئے جب وہ ضیاالحق کے ساتھ ساتھ صدام، سعودی حکمرانوں، اردن کے شاہ عبداللہ کو لعن طعن کرتے تھے۔ وہ مجھے کیوں اپنے اپنے لگے تھے۔ وہ تو عرب تھے۔ میرے سامنے بیٹھ کر انہوں نے اپنے دل کے پھپھولے کیوں پھوڑے؟ انہوں نے عربیوں پر لعن طعن کیوں کی۔ اُن سے تو انکی نسلی قرابت داری تھی۔

اگر میں یہ سوال اٹھاؤں کہ ہندوستان اور پاکستان کے بائیں بازو کے دانشوروں، ترقی پسندوں اور دنیا بھر کے کامریڈوں کا کعبہ وقبلہ ماسکو کیوں تھا؟ کارل مارکس اُنکا پیغمبر اور لینن اُنکا راہبر کس لیے تھے؟ لینن روسی اور کارل مارکس جرمن یہودی تھا۔ کہیں کوئی تہذیبی اور ثقافتی مماثلت ہی نہیں تھی۔

اب ایسے میں کہیں یادوں سے رالف رسل (Ralph Russell) کی آٹو بائیوگرافی سے نکل کر سامنے آگئی ہے۔ اُسے پڑھتے ہوئے کئی بار احساسات عجیب سے ہوئے تھے۔ اپنی سوانح عمری کے دوسرے حصّے Losses, Gains جو 1945 سے 1958 تک کے دور کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ ایک جگہ وہ برطانیہ کی کیمونسٹ پارٹی کے بارے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس بین الاقوامی قسم کی فوج جس میں دنیا کی ہر قوم اور مُلک کے مرد، عورتیں، رنگ، نسل، زبان قومیت اور سٹیٹس سے بے نیاز ایک عدل و انصاف پر مبنی معاشرے کے حصول کیلئے کام کر رہی ہے کو دیکھ کر مجھے اپنے اندر ایک بے پایاں مسرت اور توانائی محسوس ہوتی ہے۔

رسل اپنے کیمونسٹ ہونے کا اظہار ایک تفاخر سے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اور پارٹی کا ہر ممبر خود کو دنیا کے پارٹی ورکرز کے ساتھ نظریاتی تعلق اور رشتے کی ایک مضبوط ڈور میں بندھا محسوس کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اُنکے فوجی تجربات کا ذکر بھی بڑا متاثر کن

ہے کہ آسام میں اپنی تعیناتی کے دوران انکی خفیہ سرگرمیوں اور جدوجہد کا اولین ہدف برطانوی مفادات نہیں اپنی کیمونسٹ پارٹی کی ترجیحات تھیں۔ اُنکی دلی ہمدردیاں اور محبتیں اُن Sepoy (نچلے درجے کے فوجی) کے ساتھ تھیں جنہیں وہ انگریز ہونے کے باوجود برٹش گورنمنٹ کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور آزادی حاصل کرنے کیلئے اُکساتے تھے۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب سوویت ٹوٹا۔ پاکستان میں بائیں بازو کے لوگ بے حد افسردہ وملول تھے۔ ایک دوسرے کے گلے لگ کر زار زار روئے۔ ایک دوسرے کو پُرسے دیئے۔ کیوں؟ یقیناً اس لیے کہ یہ اس نظریاتی ہم آہنگی کی موت تھی۔ یہ اُن خوابوں، اُن امیدوں کا جنازہ تھا جو سابق سوویت یونین کی صورت وہ دیکھتے تھے۔ انہیں فخر تھا کہ اِس کیمونسٹ ریاست کی چھلانگیں مارتی ترقی نے سرمایہ دارانہ نظام پر دہشت طاری کررکھی ہے۔ اِس دنیا کا تو دن کا چین اور راتوں کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ اور اب وہ کامیاب ہوگئے تھے۔ کامریڈوں کی دنیا لٹ گئی تھی اور سرمایہ دار دنیا خوشی سے بغلیں بجارہی تھیں۔

اب میں خود سے پوچھتی ہوں تو واسطہ ہوا نا۔ واسطہ تو گئے گوڈوں میں چھوڑ روح تک میں بسا ہوا ہے۔ مجھے یاد ہے 1952 میں میرے بڑے ماموں حج کیلئے مکہ گئے۔ کرنسی بدلوانی تھی۔ انہوں نے منی چینجر سے بات کی۔ ریٹ طے ہوا اور وہ اپنے ہوٹل ڈالر لینے آئے۔ جب دوبارہ اُس کے پاس گئے وہ پہلے کے بتائے ہوئے ریٹ سے منکر ہوگیا۔ میرے ماموں بڑے دبنگ انسان تھے۔ بولے ابھی پانچ منٹ پہلے تو بات ہوئی تھی۔ تم اہل مکہ ہو ہی خبیث لوگ۔ تم نے میرے نبی کو جن اذیتوں سے دوچار کیا ہمارے لیئے تو یہی تمہیں جاننے اور سمجھنے کیلئے کافی ہے۔ اُس بہت پڑھے لکھے شخص نے اس نہج پر سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ عجمی مسلمان ہے اور اُسکا نبی عربی تھا۔ وہ تو اس مسلک کا پیروکار تھا جو اُس کے نبی نے بتایا تھا کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں ہاں اگر فضیلت ہے اور فوقیت

ہے تو وہ صرف تقویٰ کو۔

نبی کی اِس بات پر کس نے کان دھرے۔ بیسویں صدی میں عرب قومیت کے شوشے نے وہ طوفان اٹھایا کہ ایک عظیم مسلمان سلطنت مغرب کی ریشہ دوانیوں اور اپنوں کی مفاد پرستیوں کے ہاتھوں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔

تو میں ترقی پسندوں کے جواب میں کہنا چاہوں گی۔ ارے بھئی میرا بڑا گہرا ناطہ ہے۔ سمرقند میں میں امیر تیمور کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد میں نے اُس سے شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

قدرت نے تمہیں کتنی شجاعت دی تھی۔ ایک ٹانگ کی کجی دے کر اُس نے تمہارے دونوں ہاتھوں کو کمال بخش دیا تھا کہ تمہارے ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے تلوار چلانے کے ماہر تھے۔ تم حافظ قرآن تھے اور خود کو مجاہد اسلام کہتے تھے۔ پر تمہاری تلوار نے جتنی جنگیں لڑیں اُن میں بہت سی مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ فتح کے بعد ہزاروں کیا لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا۔ آخر تم انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنا کر دنیا پر اپنی دہشت کیوں اور کس لیے بٹھانا چاہتے تھے تم نے عثمانی سلطان بایزید اول جو یلدرم (برق) کے نام سے جانا جاتا تھا اور جو تمہاری طرح ہی دلیر اور بہادر تھا جس کی فتوحات کا دائرہ مشرقی یورپ تک پھیل رہا تھا۔ تم کتنے خود غرض نکلے۔ ذرا سی انا کی ذلّت تم سے برداشت نہ ہوئی اور اسی طرح وہ بایزید جس کی پے در پے کامیابیوں نے اُسے بڑا متکبر بنا دیا تھا۔ جس کی بصیرت کی آنکھ اُس طوفان کو نہ دیکھ سکی جو تیمور کی صورت اس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ نتیجہ وہی تھا۔ ایک دوسرے کا بیج مار دیا گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ مجھے کیا زندہ نہیں رہنا۔ میرے پاس اور کونسا جذباتی سہارہ ہے۔ جسے تم لوگ چھین لینا چاہتے ہو۔ تم نے وہ کہانی نہیں سُنی۔ برصغیر کی تحریک آزادی کے

دوران ایک احتجاج کے نتیجے میں مال روڈ پر صفائی کرتے دو خاکروبوں کے درمیان گفتگو کا محور کچھ یوں تھا۔

ایک نے دوسرے سے پوچھا تھا۔

آخر یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ ہر روز جلسے جلوس اور ہڑتالیں۔

دوسرے نے جواب دیا۔ یہ (یعنی مسلمان اور ہندو) ہم سے آزادی مانگتے ہیں۔

لاہور کے خاکروب مذہبی عقیدے کی بنا پر حکمران پارٹی کا خود کو حصّہ سمجھتے تھے۔ جو کسی بھی لحاظ سے رنگ، نسل، تہذیب و ثقافت کے حوالوں سے مقامی لوگوں کے ساتھ میچ نہیں کرتا تھا۔ مگر درمیان میں عقیدے کی ڈور تھی جو انہیں اُنکا حصّہ سمجھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ تو اب یہی مرکزی مسئلہ ہے۔

ہاں لیکن ایک سوال بھی ذہن میں اٹھتا تھا، پریشان کرتا تھا آخر کیا بات ہے؟ اب فکر و آگہی کے چشمے کیوں نہیں پھوٹ رہے ہیں؟ سوچوں پر جمود کیوں طاری ہے؟ یوں اِن کے جوابات بھی مل جاتے تھے کہ قومیں جب زوال پذیر ہو جائیں تب علم و تحقیق سے دوری پست کرداری اور بے عملی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ اس خیال کی صداقت بھی عملی طور پر سامنے آئی۔

1969 میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں اپنے قیام کے دوران ایک بار ڈھاکہ کلب میں اپنی واقف بنگالی فیملی کے ساتھ ڈنر پر صاحب خانہ کی ایک اطالوی کے ساتھ گفتگو کے دوران جب اچانک اُس نے اپنی بیوی جو میری کلاس فیلو تھی کی طرف رُخ کرتے ہوئے بنگالی میں کہا۔

"کمبخت بڑھکیں کتنی مار رہا ہے؟ سارے زمانے کی چور اچکی قوم ہے۔

کوئی چھ سال بعد اس سے ملتے جلتے ہی الفاظ میں نے اپنے کزن سے سنے جو

تربیلا ڈیم پر اطالوی اور دیگر یورپی قوموں کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ کچھ مزید سالوں بعد ایسے ہی خیالات کا اظہار لاہور کے ایک بڑے بزنس مین سے سُننے میں ملے۔

جب میں روس گئی۔ ماسکو میں پندرھویں صدی کی کریملن کی عمارتوں کا حسن ان پر کندہ کاری، ان پر بکھرے آرٹ کے موتی دیکھے۔ معلوم ہوا تھا کہ یہ اطالوی معماروں اور فنکاروں کے کارنامے ہیں جنہوں نے روسی کلچر کو سمجھا اور روسیوں کے ساتھ مل کر شاہکار تخلیق کیے کہ اس وقت اطالوی قوم اپنے عروج پر تھی۔

پس تو جان لیا کہ ہم زوال کے اسی مرحلے سے گزر رہے ہیں۔

مجھے وہ مصری کبھی نہیں بھولتا جس کی ٹیکسی میں میں قاہرہ الجدید میں کسی سے ملنے جارہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا۔ ڈرائیور ڈرائیوروں کی صف میں بظاہر تو شمار ہوتا تھا مگر صاحبِ علم تھا۔ صاحبِ نظر تھا۔ حالات حاضرہ پر گرفت تھی۔ پاکستان مصر کے سیاسی حالات اور فلسطین جیسے سنگین مسئلے پر میرے دلی دُکھ اور اظہار پر اُسنے کہا تھا۔

''دراصل یہ وقت کے phases ہیں۔ خداوند قوموں کو قوموں کے درمیان پھیرتا ہے۔ مصر کا ابتدائی ماضی یہودیوں کیلئے اذیت ناک تھا۔ آج اُنکا زمانہ ہے۔ ہمارے طور طریقے اور اطوار بھی پسندیدہ نہیں۔ علم مومن کی میراث ہے۔ غور و فکر اور تحقیق قرآن کا بنیادی سبق ہے۔

ہم نے اپنے نبی کی اس حدیث سے منہ موڑ لیا ہے۔ علم و تحقیق کے دروازے خود پر بند کر لیے ہیں۔ افسوس ہمارے لیڈر بھی اچھے اور مخلص نہیں۔ دس بارہ صدیوں تک مسلمانوں نے عروج دیکھا۔ اب اُنکا زوال ہے۔ وہ جنہوں نے علم اور تحقیق کو اپنایا یہ اُنکا زمانہ ہے۔ پوری اسلامی دنیا اپنے اپنے مفادات کی گھمن گھیریوں میں اُلجھی، اقتدار کی پجاری بنی فرقوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اگر تاریخ کے چکر کو سمجھ لیا جائے تو واقعی اُن

کی باتوں میں کتنی صداقت تھی؟

اب رہا بیچارہ ایک عام سا آدمی جسے پوجنے کو کچھ چاہیے، جسے اپنے کیتھارسس کیلئے کسی کے کندھے چاہیں۔خدا عالی مرتبت، عالی قدر، عظیم و بالاتر ہستی اُس کا جذباتی سہارہ۔اُس کے بھیجے گئے کسی رسول، کسی پیغمبر، اسکی وساطت سے آنے والی کتاب۔اب وہ اُسے پڑھے یا نہ پڑھے، عمل کرے یا نہ کرے پر کہیں ایک جذباتی سے سہارے اور تعلق کی ڈور تو لٹک رہی ہے نا۔

یوں یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ طاقت نے اقتدار کے بت کو بلندی پر چڑھا دیا تو چیزوں کو ناپنے ماپنے کے پیمانے بھی ہماری اپنی ہی خواہشوں کے وضع کردہ ہو گئے۔جیسے مرضی اور جس مرضی کٹھالی میں ڈال کر جو چاہو صورت دے دو۔

یہ اُلٹ پلٹ، یہ اکھاڑ پچھاڑ تو اپنے وقت مقررہ پر ہوتی ہے۔جب اوپر والا چاہے گا کہ اب کس مٹی کو اسنے اوپر لانا ہے۔کس مٹی کو اُسنے فضیلت بخشنی ہے۔اور کس نے پاتال کی گہرائیوں میں گھستے چلے جانا ہے۔

ازراہ مہربانی تم مجھ سے میرا یہ جذباتی سہارہ، میرا یہ اعزاز مت چھینو۔مجھے وابستہ رہنے دو اُن سے۔آخر کو میرے پاس بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔

مانگے تانگے کا سہی۔کشکول خالی تو نہیں اتنی تو دل کو تسلی رہے۔

تو سلطان محمد فاتح میرا ہیرو ہے کہ اُس نے میرے نبی کی بشارت کو سچا کیا اور سلیمان ذی شان پر مجھے ناز ہے کہ اُس کے گھوڑے وی آنا پہنچے۔اتاترک سے مجھے عشق ہے۔

تو اے استنبول میں تم سے وداع ہوتی ہوں۔تم جو سب میرے اپنے ہو۔تمہاری مسجدیں آباد اور شاد رہیں۔تمہارے لوگ، تمہارے کھیت کھلیان ہرے بھرے

رہیں۔تمہارے آنگن سیاحوں سے ایسے ہی بھرے پُرے رہیں۔(امین)اور ہاں میرے ملک کی بھی خیر مانگ لینا۔جیسے تم دہشت گردی کے طوفان سے نکل کر ترقی کی شاہراہ پر چڑھ گئے ہو۔ایسا ہی ہمارا مقدر ہو جائے۔(امین)

سلمیٰ اعوان

A 279 نیو مسلم ٹاؤن

لاہور

0301-4038180